حسن کار

محمد صادق ضیا

سلسلۂ مطبوعات قصر الادب

مطبوعہ رفاہِ عام پریس آگرہ

مقام اشاعت

قصر الادب۔ اگرہ

نامۂ

استاذی حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی مدظلہ العالی کے نام

ضیا نواز۔

میں اپنے احساسات کے اس مختصر مجموعے کو جس میں میری قوتِ متخیلہ سانس لے رہی ہے آپ کے اسمِ گرامی پر معنون کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ میرے ذہن میں ایک عرصہ سے کشمکشِ حیات کے متعلق سوالات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ آپ کے فیوضِ صحبت نے حقیقت کے استدراک میں جو اعانت کی ہے اسی کا کرشمہ یہ میرے مضامین ہیں گو میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ کچھ اس کا آخری درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے

کرمیں نے انکو اپنے ۱۹ سالہ زندگی کے خیالات کا آئینہ بنانے کی کوشش کی ہے

بقول اسٹیونسن یہ مضامین میری موجودہ شاہرہ حیات کے سنگِ منزل ہیں مجھے

اچھی طرح معلوم ہے کہ زندگی کے تلخ اور شیریں تجربات مستقبل میں مجھے ایک

دوسرے "حسن کار" کی ترتیب پر مجبور کردیں گے - اور میں خود اپنے خیالاتِ

موجودہ سے برسرِ پیکار نظر آؤنگا - لیکن

"امروز امروز و عہد حسن را فرداست"

انسانی زندگی کے مختلف مراحل میں ایک مرحلہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنے خیالات

کو انسانیت کی صحیح تمائندگی سمجھنے لگتا ہے اس کے بعد بہت ممکن ہے کہ

ازدواجی اور عملی زندگی میں قدم رکھنے سے اس حقیقت کا بطلان ہوجائے

تاہم اس منزل کے احساسات کا اظہار بھی ناگزیر ہے یہ مضامین روحانیت

اور مادیت کی جنگ کا حاصل ہیں - یہ واقعہ ہے کہ میں سکون میں جو روحانیت

محسوس کرتا ہوں مادیت میں مجھے اس کا شائبہ تک نظر نہیں آتا - ان

مضامین کو مادیت کے خلاف ایک احتجاج سمجھنا چاہئے - اور میں نے ہر ہر

قدم پر یہی سمجھانے کی کوشش کی ہے - لیکن پھر بھی میں راہب نہیں ہوں

"یہ گھٹائیں یہ چمن یہ سبزہ زار اور یہ بہار"

امید کہ آپ اس عقیدت اور محبت کی روشنی میں جو مجھے آپ سے ہے میرے اس عقیدت کے گلدستے کو شرف قبولیت عطا فرمائیں گے۔ اور میں محسوس کر سکوں گا کہ ان پھولوں کی شگفتگی محض آپ کے شگفتِ خاطر کا نتیجہ ہے۔

چنیوٹ۔ ۴ر جون ۱۹۳۳ء

دربارِ سیماب کا ادنیٰ خادم
محمد صادق ضیا

(از پروفیسر احمد علی دہلوی - ایم - اے)

مجھ سے ضیا صاحب نے کئی مرتبہ کہا کہ میں اس کتاب پر دیباچہ لکھوں مجھے اُن کی دلشکنی کسی طرح منظور نہیں لیکن دیباچہ میری رائے میں اس شخص سے لکھوانا چاہیے جو اپنا ہم خیال ہو۔ میرے اور ضیا صاحب کے خیالات میں بہت فرق ہے اس اختلافِ رائے ہی کے سبب سے دیباچہ بجائے ایک دیباچہ کے تنقید ہو گیا ہے۔ دراصل کتاب میں بہت کچھ ہے ایک شخصیت کا اظہار — اس لئے آپ "حسن کار" کو پڑھ کر خود اپنی رائے قائم کریں۔

ضیا صاحب کے سب مضامین ذاتی ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں

کہ وہ برے ہیں - نہیں - جہاں تک زبان کا تعلق ہے بہت اچھے ہیں
ضیا صاحب کی نثر میں ایک روانی ہے، ایک اٹھلاتا ہوا اور رقص کرتا
ہوا رنگ ہے - جو ان کی شاعرانہ شخصیت کے اظہار کے لئے نہایت موزوں
ہے اُن کا طرز بیان ذاتی خیالات پیش کرنے کے لئے نہ صرف خوش اسلوب
بلکہ خوش رنگ بھی ہے - اور ایک شخص کا طرز بیان ہی اسکی شخصیت کا
ترجمان ہوتا ہے - یہ ہے اُن کا طرز بیان - "جب میں کسی شاداب اور
پُر سکوت ماحول میں صرف خرام ہوتا ہوں تو میرا جی یہ نہیں چاہتا کہ میں
اس کے تاثرات کو رنگین الفاظ میں تبدیل کر کے دنیا کو اس سے متاثر کر دوں
بلکہ وہ منظر خود ایک مرتّب شعر بن کر اس فضا میں گونجتا ہے - اور پھر
اسی فضا میں گم ہو جاتا ہے - گُم نہیں ہو جاتا بلکہ تمام فضا مجھے ایک شعر
میں مبتدل نظر آتی ہے، ایک ایسے شعر میں جو فضا اور دماغ پر بیک وقت
مرتسم ہو کر مجھے متکیف کر رہا ہو"

سوائے دو مضامین، "فن تعمیر" اور "فن مصوری"، کے ضیا
صاحب کے سب مضامین ذاتی ہیں یہ دونوں مضامین دلچسپ اور

اچھے ہیں۔ ان میں ایک حد تک "فن تعمیر" (architectures)
اور مصوری کی تاریخ بھی پیش کی گئی ہے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے
کہ میں دونوں مضامین پر غور کروں۔ میں صرف "فن تعمیر" پر اکتفا کرتا ہوں۔
ضیا صاحب نے ہندوستان میں اس فن کے زوال کا تذکرہ ضرور
کیا ہے، لیکن انہوں نے اس کے اسباب قطعی نہیں بتائے ہیں اور
نہ موجودہ architectures پر نظر ڈالی ہے در اصل ہمارے
یہاں عوام الناس میں مذاق، فن تعمیر خاص نہ تھا شاہی عمارات کے علاوہ
ہم کو اور کونسی عمارات نظر آتی ہیں جنھیں دیکھ کر ہم مرحبا کہیں اسی لئے
شاہجہاں کے بعد اس کا زوال کوئی تعجب خیز امر نہیں اس کے بعد کسی
والیٔ ملک کو اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ اپنی توجہ آرٹ کی طرف کرتا۔ آرٹ
تمول، فرصت، اور اطمینان کی چیز اور ذاتیات سے وابستہ ہے
ہندوستان میں تو فنِ تعمیر صرف ایک بادشاہی فن تھا۔ اس لئے
شاہجہاں کے بعد اس کا زوال شروع ہو گیا۔ اگر پبلک میں بھی اس
فن کی حس بڑھی ہوئی ہوتی تو شہر آگرہ (یا کوئی اور شہر) ایسا گندہ نہ ہوتا
جیسا کہ اب ہے۔

مضمون "حسن کاری" دلچسپ ہے۔ لیکن زیادہ روشن نہیں در اصل اگر کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ "حسن کاری" سے ضیا صاحب کا مطلب آرٹ ہے تو اس کے لئے یہ سمجھنا کہ "حسن کاری" کیا چیز ہے بہت دشوار ہوگا "حسن کاری" میری رائے میں لفظ آرٹ کا کسی طرح بھی مناسب ترجمہ نہیں۔ لفظ حسن کاری بنا ہے "حسن" اور "کاری" سے اس کے معنی ہوتے ہیں۔ حسن بنانا[1]۔ آرٹ یہ قطعی نہیں ہے۔ اور نہ یہ اس کے معنی ہیں یہ کہنا کہ آرٹ کیا ہے بہت مشکل ہے، اسی طرح جیسے یہ کہنا کہ زندگی کیا ہے[2] "حسن کاری" کا مطلب آرٹ پیدا کرنا ہو سکتا ہے لیکن "آرٹ" نہیں۔ اس مضمون میں ضیا صاحب نے ناول اور شاعری وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان چیزوں میں آرٹ کیا ہے

۱؎ حسن کار مصور کے معنوں کی نئی علامت ہے جس طرح فنون لطیفہ پوری طرح Fine arts کا مفہوم ادا کرنے پر قادر نہیں اسی طرح "مصور" ایک مجسمہ ساز یا تعمیر کار پر حاوی نہیں ہو سکتا اسلئے حسن کار کو آرٹسٹ اور "حسن کاری کو آرٹ" کا اردو میں قائم مقام بنایا گیا ہے۔ ضیا

۲؎ میرا لیکچر Poetry x Problem جو میں نے آگرہ کالج میں پڑھا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے۔

یا وہ کن چیزوں پر مبنی ہے۔ گو ضیا صاحب نے آرٹ کے موضوع پر بحث کی ہے، لیکن آرٹ کے بارے میں ہم اتنے ہی غریب رہے جتنے ہم انکا مضمون پڑھنے سے پہلے تھے۔

مضمون "شعر و شاعر" بلحاظ زبان اور شاعری کے خوب ہے۔ ضیا صاحب ہمیشہ اس جگہ پر بہت خوب لکھتے ہیں جہاں وہ اپنے لئے یا اپنے مذاق کے لئے معذرت پیش کر رہے ہوں۔ یہ مضمون شاعر و شاعری کا نقطۂ نظر ہے۔ اس میں ایک حسن بیانی ہے، اور ضیا صاحب نے نثر میں گویا ایک نظم ملفوظ کر دی ہے۔

مضمون "اداکاری"، اتنا اداکاری (یعنی acting) سے تعلق نہیں، رکھتا جتنا کہ خود ضیا صاحب کے تخیل سے acting میں شعرا وغیرہ کی تصاویر تخیلی سے کتنا تعلق ہے! آپ لوگ خود اندازہ کر لیں گے درحقیقت اس مضمون میں ضیا صاحب نے اپنے تخیل کے اظہار کا موقع ڈھونڈا ہے۔ آپ نے کیٹس اور ٹیگور وغیرہ کی جو تخیلی تصاویر پیش کی ہیں خوبصورتی اور دلچسپی سے خالی نہیں، گو کیٹس کو سیاہ لبادہ پہنانا زیادتی ہے، کیونکہ کیٹس میں خوشی کافی پائی جاتی ہے۔ آغاز مضمون میں ضیا صاحب

کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگ ہم کو سنیما اور تھیٹر دیکھنے سے اس لئے منع کرتے ہیں
کہ یہ اسراف پسندی سکھاتا ہے۔ حقیقت صرف یہ نہیں ہے وہ ہم کو اسلئے
بھی منع کرتے ہیں کہ سنیما وغیرہ، ان کے خیال میں، اخلاق سوز گری ہوئی
چیزیں ہیں[1]۔ کیونکہ عورتیں اسٹیج پر آتی ہیں اور حسن و عشق سے کہانیاں
لبریز ہوتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جو تصویریں ہمارے ہندوستانی
بھائی بنا رہے ہیں وہ بالکل لغو اور فضول ہوتی ہیں۔ کیونکہ انکو حقیقت
سے ذرا سا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اور مجنوں مرتے مرتے بھی گھنٹہ بھر تک
غزل گا سکتا ہے اور بغیر غزل کو پورا کئے مر نہیں سکتا۔ جب تک سنیما
یا کوئی بھی آرٹ، حقیقت کے نزدیک نہ آجائیگا وہ کامیاب نہیں ہو سکتا
لیکن ہمارے بزرگ نوجوانوں پر قطعی بھروسہ نہیں کرتے۔ وہ ہم کو خیالات
اور اخلاق میں کمزور تصور کرتے ہیں اور غالباً اسی لئے ایسی چیزوں سے
دور رکھنا چاہتے ہیں جو خیالات کو ابھاریں۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ ایک
برائی سے دور رکھنے سے خود برائی دور نہیں ہو سکتی۔ ضرورت اس

[1] میرے مضمون میں خیال بدین الفاظ موجود ہے "ہم یقیناً ان ڈراموں کو برا
کہہ سکتے ہیں جو ہماری سوسائٹی کے اخلاق پر برا اثر ڈالتے ہیں" ضیا

بات کی ہے کہ برائی کو دور کیا جائے۔

وقت نہ ہونے کی وجہ سے میں بہت کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن پہلا مضمون "میارِ زندگی" چونکہ اس کو پہلی جگہ دی گئی ہے۔ زیادہ غور طلب ہے اس لئے اور بھی کہ اس سے ضیا صاحب کے خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ابھی **ضیا** صاحب کو زیادہ سوچنے اور ایک نتیجہ پر پہونچنے کی ضرورت ہے۔ ان کو تلاش ہے "سکون قلب" کی۔ یہ کہن سالی اور غور و فکر کے بعد ملتا ہے۔ اظہار خیالات سے نہیں ملتا۔ لیکن ضیا صاحب خوب کہتے ہیں کہ "ان لوگوں کی حالت قابلِ رحم ہے" جو "زندگی میں اپنے معیار نظر کی جستجو کر رہے ہیں"۔

ضیا صاحب کی رائے میں "زندگی کا راز انسان کی روحانی قوتوں میں پنہاں ہے"، تو پھر دنیا سے واسطہ رکھنے سے فائدہ؟ روح کی تلاش تنہائی میں ہوتی ہے۔ روح کو غرور اور نام و شہرت حاصل کرنیکا ذریعہ بنانا "معیار زندگی" سے دور جانا ہے۔ لیکن مجھ کو پورا یقین ہے کہ ضیا صاحب ولایت کی رہائش کے بعد اپنے خیالات میں بہت بڑا ذوق پائیں گے۔

یہ میں نے مانا کہ "تجارت" ہم کو ہوس و حرص کا شکار کر دیتی ہے یہ بھی مانا کہ ایک نوجوان جب عملی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اسکو فضائے عالم کی خبر نہیں ہوتی۔ لیکن خبر تو بغیر تجربہ کے نہیں ہو سکتی "سوسائٹی کے زہریلے اثرات" اس پر کام کرنے لگتے ہیں اور وہ بچ نہیں سکتا۔ تعلیم شروع سے ٹھیک اور پختہ ہونی چاہئے تاکہ وہ ان اثرات سے علیحدہ رہ سکے۔ ایک بچہ کو سوسائٹی کے اثرات سے بچا لینا سوسائٹی کی حالت کو درست نہیں کر سکتا۔ پھر ضیا صاحب کا قول ہے کہ "مذہب بھی ایک سوسائٹی ہے" یہ کہاں تک بجا اور صحیح ہے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں اور جب مذہب ایک سوسائٹی ٹھہرا تو ضیا صاحب کا یہ کہنا کہ مذہب کو فساد کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے غلط نہیں۔ اگر ایک مذہب ایک سوسائٹی ہے تو دوسرا مذہب دوسری سوسائٹی۔ اور ایک سوسائٹی دوسری سوسائٹی کو بوجہ اختلاف نقطہ ہائے نظر کبھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتی۔ یا نیست و نابود کر دینے کی کوشش کرے گی یا نیست و نابود ہو جانے کی۔ اور غالباً یہ خیال کہ مذہب ایک سوسائٹی ہے۔ فساد کی جڑ ہے۔ لیکن مذہب ایک سوسائٹی نہیں ہے وہ تو جیسا ضیا صاحب خود کہتے ہیں "دل اور روح سے تعلق رکھتا ہے"

اس کو روحانیت اور اخلاقیات سے تعلق ہے، نہ کہ سیاسیات اور معاشرت اور رواج سے۔

مضمون سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ مذہب پر معیار زندگی قائم کیا جائے یا نہیں۔ لیکن ضیا صاحب کا مطلب یہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ تو پھر دنیاداری سے واسطہ؟ اللہ اللہ کیجئے۔

اب آئیے "معیار ذہنی" پر۔ "خوبصورتی" "بلند خیالی" وغیرہ جو کچھ ضیا صاحب فرماتے ہیں بالکل درست اور بہت خوب ہے۔ لیکن ایک آدھ ہی جملہ کے بعد میں پڑھتا ہوں کہ "اگر ہماری روحانی قوتیں، ہمارے ساتھ مصروف عمل ہوں گی تو ہم دنیا کی برائیوں کو بھی حسین بنالیں گے" کم از کم میرا ذوق روحانی اور غالباً کسی اور کا بھی (سوائے پیغمبروں اور اولیا کے جو صرف اللہ کے بندے ہیں) اتنا بڑھا ہوا نہیں ہے کہ میں بدبو کو خوشبو مان لوں یا بدہیئتی کو خوبصورتی وغیرہ وغیرہ یہ تو حقیقت کے خلاف جاتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میرے دیباچہ کے دوران میں ظاہر ہو گیا ہوگا ضیا صاحب ایک بڑے idealist معلوم ہوتے ہیں اور idealist

کو حقیقت سے زیادہ لگاؤ نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنی فرضی اور تصوراتی دُنیا
میں خوش رہتے ہیں۔ اور افلاطونی خیالات اُن کے دل و دماغ
میں موجزن ہوتے ہیں۔

لیکن اس رفتار سے تو میں اپنے دیباچہ کے اختتام تک کبھی
نہیں پہونچ سکتا۔ مجھے ایک جدید امریکن شاعر الفریڈ کریمبورگ
(A. Kreymborg) کی نظم Idealists یاد آتی ہے۔
اس کا ترجمہ پیش کرکے ختم کئے دیتا ہوں۔

اے بھائی درخت:
تم اسقدر بڑھے کیوں چلے جاتے ہو؟
کیا تم اس مغالطے میں ہو کہ ایک دن تم آسمان تک پہونچ جاؤ گے؟

اے بھائی دریا:
تم اس قدر بہتے کیوں ہو؟
کیا تم اس مغالطے میں ہو کہ ایک دن سمندر کو بھر دو گے۔

اے بھائی پرند:
تم اتنا گاتے کیوں ہو؟

اے نوعمر جوان:

تم اس قدر بسیار گو کیوں ہو؟

بہر حال ضیا صاحب سے ہم لوگوں کو بہت کچھ امید رکھنی چاہیے
ان میں مضمون نگاری کا مادّہ بہت اور خوب ہے مجھے امید ہے کہ ضیا صاحب
کا تجربہ اور تعلیم جس قدر بڑھتی جائے گی وہ ہمارے آرٹ ادب اور زندگی
کے لئے اتنے ہی زیادہ مفید کام کرتے جائیں گے۔

احمد علی
اگرہ ۵ر دسمبر ۱۹۳۳ء

از مرزا تجمل حسین نجم آفندی اکبر آبادی چیف ایڈیٹر
رسالہ مشورہ آگرہ

دنیا میں اکثر و بیشتر ایسے امور انسانی مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ جن کو عجائبات سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ بھی انہیں میں سے ایک ہے کہ میں مضامین کے اس بیش بہا مجموعہ کا دیباچہ لکھ رہا ہوں۔ جس کا نام "حسن کار" ہے۔ میں نے اس انتخاب کے متعلق احتجاج کیا تھا اور میں جانتا تھا کہ یہ خدمت کسی ایسے دل و دماغ کے سپرد کی جاتی جو اس کا اہل

ہوتا۔ لیکن "قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند"۔

مضامین کی تخلیق ترتیب تنظیم میں حسن کاری کی پوری قوت صرف کی گئی ہے۔ وہ دیباچہ کس قدر غیر متعلق معلوم ہوگا جو ایسے قلم سے لکھا گیا ہو جس کی صرف ایک خصوصیت ہو جسے الم کاری کہہ سکتے ہیں بہر حال ناظر کی بے کیفی اور بے ربطی کے اس حادثہ کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔

میرے کرم فرما جناب ضیا چنیوٹی کو اگر ناظر تصور میں دیکھنا چاہے تو اس مجموعہ کے نام سے مدد لیکر دیکھ سکتا ہے آپ کی ادبی قابلیت کا اندازہ اُن حسن کارانہ الفاظ سے ہو سکتا ہے جن سے ان مضامین کی تشکیل کی گئی ہے۔ وسعت نظر اور معلومات کا پتہ وہ مختلف موضوع بتائیں گے جن سے یہ اوراق مرتّب و مرکّب ہیں۔ آپ کے لطافت ہوش اور احساس کی پاکیزگی تک نگاہ اس وقت پہونچ سکے گی جب الفاظ کے پیکر میں تڑپنے والی روح سے بھی واسطہ رکھا گیا ہو اس تصنیف پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد اگرچہ ضیا صاحب خود سامنے آجائیں گے لیکن میں بھی اپنا یہ فرض محسوس کر رہا ہوں کہ ناظر کو یہ بتاؤں کہ۔
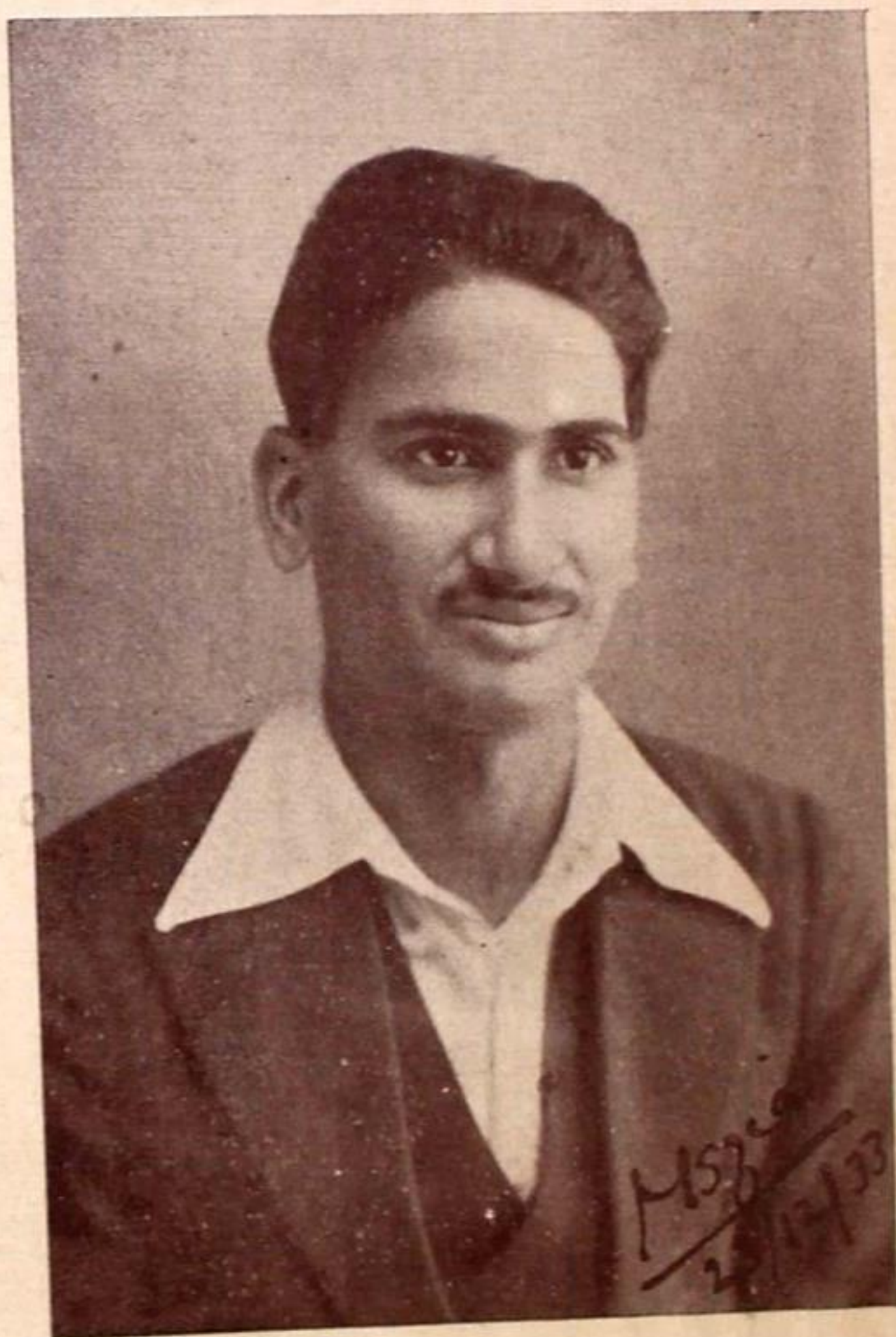
مہدی صادق ضیاؔ - مصنف "حسن کار"

جناب ضیا ایک خوش اخلاق اور خوشگو شاعر ایک جواں سال اور جواں خیال ادیب ہیں۔ آپ کا وطن چنیوٹ زندہ دلوں کے اس خطہ میں ہے جسے پنجاب کہتے ہیں آپ کے والد بزرگوار بہ سلسلۂ تجارت آگرہ میں مقیم ہیں اور آپ۔ بی۔ اے کلاس آگرہ کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں شعر و ادب میں میرے محترم دوست حضرت سیماب اکبرآبادی سے استفادہ کا فخر حاصل ہے۔

آپ کی بہت سی نظمیں اور مضامین مختلف اخبار و رسائل کے صفحات پر دُنیائے ادب سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں اور موصوف ادبی دُنیا میں غیر متعارف نہیں ہیں۔ اپنے فطری ذوق و انہماک کی بنا پر آپ نے جو سیماب لٹریری سوسائٹی آگرہ میں قائم کی ہے۔ اس کے جلسوں میں اب تک جس قدر مضامین آپ نے ارشاد فرمائے ہیں یہ کتاب انھیں مضامین کا مجموعہ ہے۔

میرے پاس اگر وقت ہوتا میری مسلسل علالت اگر میرے دل و دماغ کو برباد نہ کر دیتی تو کچھ شکستہ الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا ضرورت تھی کہ مضمون نگاری کے اصول جو اُدبا نے قائم کئے ہیں یا ان کی حدود

جو بیان کئے جاتے ہیں مضمون کے محاسن و نقائص مضمون نگاری کی نزاکتیں اور لطافتیں ان سب پر ایک تبصرہ کرنے کے بعد ان مضامین کی خوبیوں پر نظر ڈالی جاتی لیکن میری مجبوریاں اس کی اجازت نہیں دیتیں اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ایک سرسری نظر ڈالتا ہوا گذر جاؤں۔

مضامین مختلف ہیں ہر مضمون ایک جداگانہ عنوان رکھتا ہے لیکن ایک چیز سب میں مشترک ہے اور وہ حسن کاری ہے ہر مضمون میں زیر بحث جو شے نظر آتی ہے وہ یہی ہے اور جناب ضیا ادبی پلیٹ فارم سے خصوصیت کے ساتھ حسن کاری کی تبلیغ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایک سرگرم اور عالم گیر مبلغ کی طرح کبھی عام انسانی جذبات سے اپیل کرتے ہیں کبھی کوئی مخصوص ہستی ایک شاعر مصور یا صناع ان کا مخاطب ہوتا ہے اس مجموعہ میں حسن کاری کے موضوع پر ایک مستقل مضمون بھی شامل ہے گویا ان مضامین کی تحریر کے وقت آپ کے پیش نظر سب سے اہم مقصد حسن کاری کی ترویج و توسیع تھا اور یہ ایک بہترین اصول ہے کہ انسان کا ایک مطمح نظر ہو اور اپنے وقت کا ایک حصہ ایک مقصد اور ایک پیام کے لئے وقف کر دیا جائے۔

ایک مضمون نگار اور مضمون کی خصوصیات کے متعلق گذشتہ و موجودہ اہل علم کی جو رائے ہو مجھے اس وقت اوس سے بحث مقصود نہیں اس مسئلہ میں میرا نقطۂ نظر ایک سیدھی سی بات ہے۔ مضمون نگار اپنے ضمیر یا اپنی تخیل کا ایک پیامی ہوتا ہے اور اُس کا مضمون ایک پیغام۔ مضمون کے دو بڑے حصّے ہوتے ہیں۔ ایک نفس مضمون جسے روح سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ الفاظ جو اوس کو دوسروں تک پہونچانے میں صرف کئے جاتے ہیں۔ جن کو جسم کہہ سکتے ہیں۔ گویا نفس مضمون ایک حقیقت ہوتی ہے اور جن الفاظ میں اوس مقصد کو بیان کیا جاتا ہے وہ اس حقیقت کا مجاز ہے اب ان دونوں کے متعلقات ہیں جن میں سے مخصوص نفس مضمون کے لئے اوس کی اخلاقی اور افادی اہمیت ایک جزو اور دعوی کے (نفس مضمون ایک دعوی ہی کی حیثیت رکھتا ہے) عقلی اور نقلی دلائل دوسری شاخ ہے۔ نفس مضمون بھی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک سطحی نظریہ ہوتا ہے اور ایک روح کی آواز ہوتی ہے اسی طرح دلائل کمزور بھی ہوتے ہیں اور مضبوط بھی۔ الفاظ کے لئے اون کا مناسب انتخاب پیرایۂ آغاز۔ انتظام۔ تکملہ۔ یہ مضمون کے دوسرے حصّہ کی

خاص خاص شاخیں ہیں۔

حسن صورت بھی بجائے خود ایک اچھی چیز ہے اور حسن سیرت بھی اگر ایک انسان کی سیرت اچھی ہے لیکن حُسن ظاہر سے محروم ہے تو یقیناً اوس میں کمی رہ گئی اور اگر حسن صورت ہے اور حسن سیرت مفقود تو بہت بڑی کمی رہ گئی۔ لیکن جس میں دونوں چیزیں جمع ہوں اس کو دوسروں پر بلاشبہ ترجیح دی جائے گی۔

بالکل یہی صورت مضمون کی ہے ایک مکمل مضمون وہ کہا جاسکتا ہے جس کی حقیقت اور مجاز دونوں مکمل ہوں میرے نقطۂ نظر سے ایک مضمون کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے اگرچہ یہ معیار ابھی بہت کچھ توضیح و تشریح کا محتاج ہے لیکن اس سے زیادہ امکان نہیں کہ اس اجمال کی تفصیل کی جائے۔ جناب ضیا کی اس تصنیف میں مجھے دو چیزیں بہت نمایاں نظر آرہی ہیں جو مصنف کی علوئے فطرت اور ذہنی جودت کی دلیل ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے جو ایک سطحی نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتی ہے کہ مصنف نے دوسروں کے نظریہ سے کام نہیں لیا ہے۔ کسی فلاسفر کی تقلید سے فائدہ نہیں اُٹھایا ہے اور کسی کے اقوال کو نقل کرکے سبکدوشی حاصل نہیں کی ہے

بلکہ جو کچھ لکھا ہے وہ دوسروں سے بچا کر اور ہر مسئلہ میں اپنا نقطۂ نظر قائم کر کے ایک اجتہادی شان پیدا کی ہے فکر کی اس جواں ہمتی سے آیندہ بہت خوشگوار امیدیں پیدا ہوتی ہیں۔ ع

"سالے کہ نکوست از بہارش پیداست"

دوسری کیفیت جو شدتِ نظر دریافت کر سکتی ہے یہ ہے کہ ہر مضمون میں جو روح کار فرما ہے وہ مصنف کے ضمیر کی آواز معلوم ہوتی ہے کسی وقتی جذبہ کا تاثر نہیں ہے۔ خیالات کا عمق الفاظ کا تموج اور بے تکلفانہ آمد کی شان ناظر کو اس خصوصیت کے سمجھنے میں مدد دیں گے۔

"معیارِ زندگی" کی چند مختصر سطروں میں جو پیام دیا گیا ہے وہ ایک باصول زندگی کی تلاش ہے پیام کی اہمیت سے کوئی صاحبِ ہوش انکار نہیں کر سکتا۔ پیرایۂ آغاز کی شان یہ ہے کہ مصنف نے اپنا دل چیر کر سامنے رکھ دیا ہے۔ اپنا راز کہہ رہا ہے اور یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ وہ خود سعی و تلاش کی کس منزل میں ہے "میں عملی زندگی میں اپنے خیالات .... چاہتا ہوں"

اس کے بعد مصنف یہ بتاتا ہے کہ "زندگی کا راز لمحات غور و فکر

میں پوشیدہ ہے" اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب ضمیر کی آواز بہت صاف اور واضح طور پر سنائی دیتی ہے جس کے بعد خود بہ خود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ضمیر کی آواز کو دبا دینا زندگی میں ناکامی کا سبب ہے۔

"انسان اپنی فضا میں ایسی لچک .... تصور کرنے لگیں"

دنیا سے بے تعلق رہ کر دنیا پر حکومت کرنا یہ شرافت نفسی کی منزلِ آخر ہے اس کی ایک جھلک دکھا کر مصنف نے ایک عجیب پر لطف بات کہی ہے اور ڈارون کی بوزنہ نوازی پر جو الزام عائد کیا ہے وہ تمام ان اعتراضات سے علیحدہ اور مضبوط ہے جو اب تک کئے گئے ہیں کس لطف کے ساتھ اپنی ہمعصر تعلیم یافتہ نوجوانوں کے جرم کو ہلکا کر دیا ہے اور اس قومی نقصان کا ذمہ دار سائنس کے اس پرستار کو ٹھہرایا ہے کہ موصوف کی طباعی اور ذہانت پر دیر تک دل مزہ اٹھاتا رہا۔

کیا خوب بات کہی ہے کہ زندگی کو خشک بنا لینا ایسا ہے گویا زندگی کے مسئلہ پر غور نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ فطرت خود رہبانیت کی مخالف ہے ورنہ تبسم کی تخلیق ہی کیوں کیجاتی۔ دنیا میں ایک ہیبت ناک سناٹا روح فرسا تجرد خاموشی اور ریاضت کا عمل ہوتا اور انسانی امتحان

کم سے کم دائرہ میں محدود ہو کر رہ جاتا۔ اسی وجہ سے اسلام نے رہبانیت کی تعلیم نہیں دی کہ وہ عین فطرت ہے۔

تکملۂ کلام اس پر کیا گیا ہے "با اصول رہنا زندہ رہنا ہے" اور یہ زندگی کا نہایت جامع PRINCIPLE ہے جسے ضرب المثل ہو جانا چاہئے

مجھے افسوس ہے کہ علیم الفرصتی کے باعث میں دیباچہ لکھنے کا فرض ادا نہ کر سکا دیباچہ مختصر "کتاب سے تعارف کرا دینے کا نام ہے۔ ضرورت تھی کہ میں فرداً فرداً ہر مضمون کے متعلق اظہار خیال کرتا مگر مکروہات زمانہ بہت سے ایسے ضروری امور میں حائل ہو کر فرد گذاشت کے ملزم ٹھراتے رہتے ہیں۔ بہر حال مجھے یقین ہے کہ اہل نظر کے لئے کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہے اور وہ مجھ سے زیادہ اس کی خوبیوں کو محسوس کر سکیں گے۔

میری دعا ہے کہ جنابِ مصنف ایسی بہت سے اصلاحی خدمات انجام دیکر اپنے زرین اور قیمتی وقت کی پوری پوری قیمت وصول کریں۔

نجم آفندی

از مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ بی اے۔ ایل ایل بی وکیل

چیف کورٹ مارواڑ

زیرِ نظر مجموعہ مسٹر ضیا چنیوٹی کے ان مختصر مضامین کا ہے جو سیماب لٹریری سوسائٹی آگرہ کے جلسوں میں پڑھے گئے تھے۔ علامہ سیماب کی ذات ذوالصفات کسی تعارف کی محتاج نہیں اور یہ آپ ہی کا فیضان ہے کہ آگرہ میں ایک چشمۂ ادب جاری ہے۔ مسٹر ضیا

ان کے ہو نہار شاگردوں میں ہیں جن پر بجا طور پر حضرت سیماب فخر کر سکتے ہیں۔ جوش عقیدت اور استاد سے محبت یہ دو ایسی چیزیں ہیں جو اپنی پوری مشرقی روایات کی گرمی کے ساتھ حضرت علامہ کے شاگردوں میں موجود ہیں۔

زیر نظر مجموعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہے ادب لطیف اور افسانہ لکھنے والے ایک دو نہیں بہت ہیں مگر اس قسم کا لٹریچر ملک کے کہنہ مشق ادیب بھی پیش کرنے سے قاصر ہیں "حسن کار" کے تمام مضامین میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر مضمون میں نوجوانی کی گرمی اور حسن کی تپش موجود ہے۔ حتیٰ کہ بعض جگہ تو عبارت اس کی گرمی سے جلنے لگتی ہے۔ جس کی حدت سے پڑھنے والے کی طبیعت میں ایک خوشگوار ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔

مصنف ابھی نوعمر ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے طبیعت میں شاعری اس طرح رچی ہوئی ہے اور اس کو چلا دینے والا ایسا استاد کامل ملا ہے کہ نثر پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے پردے میں شاعر بول رہا ہے جملوں میں غزل پنہاں ہے اور فقروں کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ اگر خود مصنف اپنی زبان سے پڑھتا تو شاید جھوٹے لگتا۔

مصنف کی نگاہ غالباً ہر شے میں حسن ڈھونڈھتی ہے اور کیٹس Keats کی طرح حسن کو پاکر مصنف کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔

قوتِ بیانیہ اپنی پوری رنگینیٔ تخیل کے ساتھ جو دیکھتی ہے وہ بیان کرتی ہے اور جو دکھائی نہیں دیتا اس کو بڑی ایمانداری سے چھوڑ دیتی ہے۔ یہ تو چند خصوصیات ان مضامین کی ہیں۔

لیکن مصنف جا بجا اپنے مندرجۂ بالا راستہ پر عجیب و غریب بلندیاں بھی اختیار کرتا ہے اور چلتے چلتے ایکدم سے سنجیدگی اور نور کی وادی میں پہونچ جاتا ہے۔ بلکہ ایک قدم اور بڑھاتے اور اس کو دیکھئے کہ جی۔ کے چسٹرٹن کی طرح فلسفہ اور منطق کو چھوٹے چھوٹے فقروں میں پیش کرکے کسی سوال کے دونوں رُخ پیش کر دیتا ہے۔ یہ خصوصیت "حسن کاری" میں بدرجۂ اتم نظر آتی ہے۔ اور یہی مضمون مصنف کے اصلی رنگ و بو کا پتہ دیتا ہے۔

"فن تعمیر" ایک دلچسپ مضمون ہے۔ مصنف نے اس مضمون کو عجیب طرح دلچسپیوں سے بھر دیا ہے۔ تنقیدی رنگ تحقیق کے پہلو بہ پہلو

موجود ہے اور ٹھوس اور مادی- یعنی سطحی باتیں مصنف کو شعر و غزل سے
دور لے جاتی معلوم ہوتی ہیں لیکن نہیں- حسن پرست شاعر کی نظر وہی
ہے- دل وہی ہے- اور جذبات وہی ہیں- تواریخ کے دقیق مسائل اور
مٹی اور چونے کی دیواروں میں مصنف کو اصلی اور روحانی چیزیں بھی
نظر آتی ہیں اور وہ بول اٹھتا ہے- "اس فردوس ارضی (تاج محل)
میں حسن- محبت اور صداقت کو دنیاوی پیرہن دے کر بقائے دوام دیکھیے-
ایک تاج محل پر ہی کیا موقوف ہے ہر عمارت کی یہی خصوصیت ہے کہ وہ
روحانیات کو مادیات کی صورت میں پیش کرے"

مضمون "مصوری" ایک تنقیدی مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن
اسمیں بھی اس قدر باریک بینی سے مصنف کام لیتا ہے اور کسی تصویر
کو اس قدر غور و خوض سے دیکھتا ہے کہ خود اس کے حسن میں جذب ہوتا
ہوا معلوم ہوتا ہے- حضرت چغتائی کی تصویر شمع فروزاں اگر آپ نے
نہیں دیکھی تو اب دیکھیے- مصنف اس کو اس طرح دیکھتا اور دکھاتا ہے:
"اس تصویر کے نازک اور منحنی خطوط میں جب نگاہ جذب ہو جاتی
ہے تو بہ یک وقت دو شمعیں فروزاں نظر آتی ہیں- مصور کا کمال یہ ہے کہ

کہ ایک مجبور عورت کے حرکات وسکنات سے شمع کے مقابلہ میں ایک، دوسری شمع قائم (روشن؟) کر دی ہے۔ عورت عالمِ خیال میں بیٹھے بیٹھے اپنے ہاتھوں میں لمبے لمبے بال لئے ہوئے انہیں بیساختگی کے ساتھ بالائی فضا کی طرف اُٹھا دیتی ہے۔ یہ دونوں ہاتھ آپس میں مل کر توبن جاتے ہیں اور بال دہوئیں کی تصویر نگاہ میں کہینچ دیتے ہیں اس حالت میں عورت کے جل کہانے سے "دودِ پیچاں"، اور شمع فروزاں کا مرقع پیدا ہو جاتا ہے۔ اور چہرے کا روشن پہلو اس انسانی شمع کی فروزانی ثابت کر دیتا ہے"

اسی طرح ماسٹر اللہ بخش پنجاب کے مایۂ ناز آرٹسٹ کے شاہکار "رادہا کرشن"، کی تصویر کی ایسی دلچسپ تصویر کہینچی ہے کہ شاید الفاظ کے ذریعہ اسقدر صحیح تصویر کہینچنا ہر شخص کے لئے ناممکن ہے۔ وجہ دراصل یہ ہے کہ مصنف کی تیز نظر جو حسن اور شعریت کی متلاشی ہے جس جگہ بہی ان دونوں چیزوں میں سے کسی کو دیکھ لیتی ہے اس کو اپنے میں اس طرح جذب کرنیکی کوشش کرتی ہے کہ بیان میں لطف پیدا ہو جاتا ہے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ حقیقت گوئی تحقیق و تدقیق اور فلسفہ تمام مضامین کی جان ہیں۔ تمام مضامین میں فلسفہ کی اس قدر عمدہ چاشنی ہے کہ معلوم ہوتا ہے۔ ہر مضمون کی دلچسپی کا دار و مدار اسی پر ہے۔

مسٹر ضیاؔ ابھی انڈر گریجویٹ ہیں اور اس عمر میں اسقدر دلچسپ اور کارآمد مضامین لکھنا ان کے لئے قابل مبارکباد ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے خود اس سوسائٹی کے کارکنوں اور گرم جوش ممبروں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جن کے علمی مشاغل اور ادبی کاوشوں کی خود حضرت ضیاؔ ایک نہایت ہی درخشندہ پیداوار ہیں یہ مضامین اس قابل ہیں کہ کالج اور اسکولوں کے کورس میں رکھے جائیں اور اب ہمیں دیکھنا ہے کہ آگرہ یونیورسٹی اپنے اس ہونہار فرزند کی کتاب کو کب خود اسی کلاس کے لئے نصاب تعلیم (Course Book) قرار دیتی ہے جس میں کہ مصنف پڑھتا ہے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی

مضمون	صفحہ
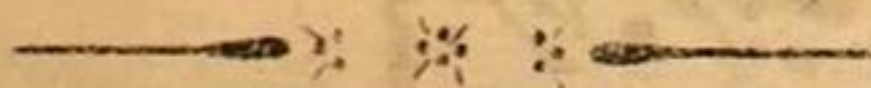
معیارِ زندگی

زندگی کا سب سے اہم مسئلہ کسی چیز کے متعلق ایک خاص معیار قائم کرنا ہے۔ بعض اوقات میں تو ایسی ذہنی کاوشوں میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں رہتا کہ میں کیا چاہتا ہوں جو چیز سامنے آتی ہے یہی احساس ہوتا ہے کہ اس میں زندگی کی دلچسپیاں تلاش کی جائیں اور اس کو اپنے معیارِ نظر کے مطابق بنا لیا جائے۔ مجھے زندگی میں دلچسپی کی تلاش ہے مگر افسوس میں اس سمندر میں جتنا زیادہ غوطہ زن ہوتا ہوں اس کی گہرائیوں کے ساتھ ساتھ تمام چیزیں غیر دلچسپی سے بدل جاتی ہیں میں سوسائٹی میں آتا ہوں مقررین کی تقریروں سے افادہ کرنا چاہتا ہوں مگر تھوڑی دیر بعد مجھے انسانی معلومات کی کم مائگی کا احساس ہونے لگتا ہے کبھی میں فطرت کے مناظر میں کھو جاتا ہوں مگر میرے سکونِ قلب کے لئے وہ

بھی ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔ کبھی میں مغنی کی آواز میں دلچسپی ڈھونڈتا ہوں مگر آہ! مجھے اس میں بھی بے سکونی کی لہر مضطرب نظر آتی ہے۔ میری زندگی کا سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ دنیا میں اطمینان قلب کس چیز میں پنہاں ہے؟ اور جس دن میں نے اپنے اس سوال کا صحیح جواب حاصل کر لیا میں یقین کر لونگا کہ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔

ایک فلسفی ایک متصوف اور ایک دیوانۂ مذہب سے زیادہ ایک شاعر کی کیفیات قابلِ فکر و غور ہیں ابھی وہ مسرتوں کے کیف میں ڈوب جانا چاہتا ہے۔ مسرت کی دیوی کو دعوتِ رقص دے کر نشاط روح کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اور ابھی وہ ہی شاعر اپنے تیرہ و تاریک کمرے میں بیٹھا ہوا اپنے جذبات سے کھیل رہا ہے۔ مگر پھر بھی یہ معمہ قابلِ حل رہجاتا ہے کہ کارزارِ زندگی میں فلسفی کامیاب ہے یا دیوانۂ مذہب۔ شاعر کو زندگی کی حقیقت کا راز معلوم ہو چکا ہے یا ایک صوفی کو؟

اُس شخص کی حالت واقعی قابلِ رحم ہے جو زندگی میں اپنے معیارِ نظر کی جستجو کر رہا ہو اور ذہنی کاوشیں کسی ایک چیز کو خوشنما بنا کر اس کی روح کے سامنے پیش کریں وہ تھوڑی دیر کے لئے اس میں جذب ہو جائے

اور پھر اس کا احساس اس کی روح پر اس چیز کی حقیقت منکشف کرنے کے بعد روحانی تکلیف کا باعث ہو۔ اعتبارات کی دنیا میں ہم یہ دیکھنے کے عادی ہیں کہ فلاں شخص کے کیا مدارج اور کیا مراتب ہیں؟ اس کی عمر کیا ہے؟ اور وہ سوسائٹی میں کیا درجہ رکھتا ہے؟ لیکن یہ سب مادی لبادے ہیں جو، زندگی کے غیر محسوس مجسمے پر اعتبارات کی دلکش فریب کاریوں کے ہاتھوں چڑھا دیئے گئے ہیں۔ دراصل زندگی کا راز انسان کی روحانی قوتوں میں پنہاں ہے۔ زندگی کا راز انسان کے لمحات فکر و غور میں پوشیدہ ہے اور میری نظر میں وہ ہستی دنیا کی تمام ہستیوں سے بالاتر ہے جو سنجیدگی کے ساتھ اپنے ضمیر کی آواز پر متوجہ ہوتی ہے پھر اس پر اپنی روحانی اور جسمانی قوتوں کی طاقت سے عمل پیرا بھی ہو جاتی ہے۔

میری ڈائری کے پہلے صفحے پر یہ الفاظ درج ہیں:۔

'.... I wish to be the personification of my own ideal'

یعنی میں عملی زندگی میں اپنے خیالات اور جذبات کی صحیح تصویر بنجانا چاہتا ہوں۔ مجھے اس نظریے پر پورا یقین ہے کہ یہ فیصلہ ایک شخص

کی ذاتی رائے پر مبنی ہے کہ آیا وہ کامیاب زندگی بسر کرنا چاہتا ہو یا ناکام۔ ایک ناکام شخص کی تخریب محض اس کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ بارہا اس کی زندگی میں ایسے مواقع آئے ہوں گے کہ اس نے وقتی فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے ضمیر کی آواز کو دبا دیا ہوگا۔ ایسی صورت میں ضمیر کی آواز اس قدر دب جاتی ہے کہ پھر اس کا بروئے کار آنا ایک خیالی چیز ہو کر رہ جاتا ہے۔

کامیاب زندگی یہ نہیں ہے کہ دنیا کو دارالمحن سمجھ لینے کے بعد کنارہ کشی اختیار کر لی جائے یہ تو ناکام زندگی کا ایک بیّن ثبوت ہے کامیاب زندگی یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر انسان اپنی فضا میں ایسی لچک پیدا کرے کہ بے تعلقی کا ثبوت دیتے ہوئے بھی وہ فضا پر ایک حکمراں کی حیثیت سے حکومت کر سکے۔ ہم خود ہی ایسی زندگی کیوں نہ بسر کریں کہ دوسرے افراد ہماری تقلید کو ناگزیر تصور کرنے لگیں۔

ڈارون کا یہ خیال کہ انسان کے آباؤ اجداد بندر تھے سائنس کے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے کارآمد ثابت ہو تو ہو لیکن، اس تعلیم یافتہ نوجوان کے احساس کو کیا کیا جائے جس کا ضمیر

بے اصولی برتنے کے بعد اس لئے نادم نہیں ہوتا کہ سائنس ایسا کہہ چکی ہے۔

وہ لوگ زندگی سے کس طرح بہرہ مند ہو سکتے ہیں جن کی زندگی کا کوئی اصول نہیں ہر صبح کو طلوع ہونے والا سورج اُن کی بے اصول زندگی کی ابتدا کرتا ہے۔ سارا دن جمود یا بیکاری میں گذار دینے کے بعد اُن کی بے اصولی کا خاتمہ اُن کی نیند پر ہوتا ہے۔ اور کون جانتا ہے کہ وہ اپنی نیند میں بھی کسی قسم کی بے اصولی کا ارتکاب نہ کرتے ہوں گے۔ ان حالات میں حیوانِ ناطق اور حیوان مطلق میں کچھ تھوڑا سا ہی فرق رہ جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انسان اپنے تجارب کا محکوم ہے اور زندگی ہمارے اصول تجارب اور خیالات ہی کے مجموعے کا نام ہے، زندگی ایک جنگ ہے جس میں ہم اپنے اصول تجارب اور خیالات کو اپنا زرہ بکتر بنا کر لڑتے ہیں۔ انسان دنیا میں ایک معصوم فطرت لے کر آتا ہے۔ رفتہ رفتہ دُنیا کی رنگینیاں، عالم رنگ و بو کی دلنشیناں، اور ہوس و حرص کی دلچسپیاں اسے معصیت کی طرف مائل کر دیتی ہیں اور آخر وہ سمجھنے لگتا ہے کہ زندگی ہی معصیت اور معصیت ہی زندگی

ہے۔ ایک شخص سن شعور کو پہونچنے کے بعد عملی دنیا میں پہلا قدم رکھتا ہے اسے کچھ معلوم نہیں کہ دنیا کی فضا کیسی ہے۔ سوسائٹی اسیر اپنا رنگ چڑھانے کے لئے مسموم ہوا کی طرح اس کی طرف دوڑتی ہے۔ رفتہ رفتہ سوسائٹی کے زہریلے اثرات میں خود ایک قسم کا زہر تخلیق ہو جاتا ہے۔

ایک معصوم فطرت نوزائیدہ بچے کو سوسائٹی کے مہلک اثرات سے ارادتاً محفوظ رکھنے کی کوشش کیجئے۔ اور اسے معصیت کی ہوا تک نہ لگنے دیجئے۔ وہ یقیناً ایک دن اپنے زمانے کا گوتم بن جائے گا۔ روح کے وہ تمام حجاب جو آلودگی سے بصیرت پر طاری ہو جاتے ہیں۔ اس کی نگاہوں سے اٹھ جائیں گے اور وہ دنیا کے انسانوں میں، ایک ممتاز انسان بن کر آپ کو بتا سکے گا کہ زندگی کی کامیابی اور زندگی کی حقیقی مسرت کیا ہے؟

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مذہب ہماری زندگی پر، بہت زیادہ اثر انداز ہے۔ دنیا میں مختلف سوسائٹیاں قائم ہیں۔ مذہب بھی ایک سوسائٹی ہے۔ یہ کسی خاص ماحول کا پابند نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ باتیں دل اور روح سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن کس قدر افسوس انگیز رجعت ہے کہ آج مذہب ہی کو فساد کا ذریعہ

بنا لیا گیا ہے۔ اور ہم ہر برائی کو مذہب کی آڑ لے کر چھپا لیتے ہیں۔ آخر ہمارا وہی نصب العین کیوں نہ ہو جس کی ہر مذہب نے تبلیغ کی ہے اور جس پر سب متفق ہیں۔ یعنی اخلاق اور بنی نوع انسان سے محبت ؕ بہ الفاظ دیگر ہمارا مذہب "انسانیت" ہونا چاہیے۔

زندگی کو خشک بنا لینا۔ راہبانہ فطرت کا حامل ہونا اور ہر بات میں دنیا کو یقین دلانا کہ ہماری زندگی دُنیا کی تمام برائیوں سے معرا ہے در اصل یہ ظاہر کرنا ہے کہ یا تو ہم نے زندگی کے مسئلے پر غور ہی نہیں کیا اور اگر اپنی فرصت کے چند لمحات اس مقصد میں صرف کئے ہیں تو راہ سے ہٹ کر کسی دوسری طرف نکل گئے ہیں۔ جب ہم فلسفہ کا مطالعہ کر رہے ہوں۔ جب ہمارے سامنے دنیا کی مشکلات ہوں اور ہر چیز ہمیں پیچیدہ نظر آ رہی ہو تو ہمیں چاہیے کہ ہم ان تمام الجھنوں میں زندگی کی طرف رجوع کریں۔ اپنے اصولوں کو بر دیئے کار لائیں اور اپنے معمولات میں زندگی کی ایسی تڑپ پیدا کر دیں کہ ہماری ناگواریاں خوشگواری میں تبدیل ہو جائیں۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہمارے جذبات و احساسات

ہی ہم پر حکومت کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں چاہئیے کہ اپنے جذبات و حیات میں ہمیشہ شریف النفس اور صادق رہیں اور جب کوئی کام کرنے لگیں تو پہلے یہ سوچ لیں کہ یہ ہمارے لائحۂ عمل یا اصول زندگی کی مخالفت تو نہیں کرتا؟ اس کے بعد ہر بات میں خوشگواری پیدا کرنا انسان کے اختیار میں ہے۔

زندہ دلی اور خوشگواری ہی ہمارا عنوان حیات ہونا چاہئیے تاکہ سوسائٹی کے افراد ہمیں زندہ دل قرار دیں نہ کہ زاہدِ خشک، بعض لوگ اس میں اس قدر افراط سے کام لیتے ہیں کہ شریف النفسی ان سے کوسوں دور بھاگتی ہے۔ ہمارے اعمال کا مقصد زندگی میں زندہ دلی اور خوشگواری پیدا کرنا ہے نہ یہ کہ وقتی طور پر زندگی میں تمسخر کی ایک موج پیدا کرنے کے بعد ہم اپنے مستقبل کو بعض خطرات کے سپرد کر دیں۔

ہمارا معیار ذہنی، نیکی، خوبصورتی، محبت، شریف النفسی، بلند خیالی، پاکیزہ ضمیری۔ صداقت اور سعادت کی طرف رجوع ہونا چاہئیے۔ اس طرح ہم میں ہر چیز کی حقیقت سمجھنے کا سلیقہ پیدا ہو جائیگا

ہم صداقت اور شرافت کو پرکھ سکیں گے۔ حقیقی خوبصورتی اور بدصورتی میں امتیاز قائم کر سکیں گے۔ اور اگر ہماری روحانی قوتیں ہمارے ساتھ مصروفِ عمل ہوں گی تو ہم دنیا کی برائیوں کو بھی حسین بنالیں گے

اگر تم دنیا میں اپنی موت کے بعد بھی دنیا پر حکمرانی کرنا چاہتے ہو تو اپنی راہ میں ایسے نقوش قائم کر جاؤ جن پر تمہارے بعد آنے والے چلنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔ تمہارے نقوشِ زندگی آہنی سلاخوں کی طرح پائیدار ہوتے جائیں۔

میں دنیا میں جس چیز سے زیادہ بچتا ہوں وہ بیکاری ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ دُنیا کے تمام گناہوں کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ جب مجھے کوئی کام نہیں ہوتا تو میں اپنی لائبریری کی کتابوں کو ہی نیچے گرا دیتا ہوں۔ اور پھر نئے سرے سے ان کو ترتیب دیتا ہوں۔ میں ذہن کو کسی دوسری طرف الجھانے سے یہ بہتر خیال کرتا ہوں کہ میرا دماغ موضوعاتِ علمی سے وابستہ ہے۔

سوسائٹی کا ہر عمل آویزشوں سے مرکّب ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کیا تاریخ اسی انتشار کا نام ہے؛ لیکن زندگی کا ہر واقعہ تاریخ کیوں

نہیں بن جاتا؟ اور تاریخ میں صرف وہ ہی واقعات کیوں دُہرائے جاتے ہیں جو کسی نوعیت سے ساری قوم پر اثر انداز ہوتے ہوں نیز ہمارے مورخین محض اجتماعیات ہی کو کیوں موضوع تاریخ بناتے ہیں حالانکہ اجتماعیات انفرادیات کے اجزائی مرکبات کا نام ہے۔ میں انفرادی طور پر اپنا معیارِ زندگی اتنا بلند کرنا چاہتا ہوں کہ سوسائٹی مجھ سے زینت حاصل کرے نہ کہ میں اجتماعیات میں گم ہو کر رہ جاؤں۔ انسان کو اپنی تعمیر خود کرنی چاہئے یہ پست ہمتی ہے کہ وہ دوسروں کا مرہون منت ہو

جو لوگ زندگی کا نغمہ الاپتے ہیں مگر سازِ زندگی کے رکھ رکھاؤ اور اسکی تہذیب کا خیال نہیں رکھتے ان کا یہ نغمہ ایک نوحۂ حیات ہے جو وہ اپنی ناکام زندگی کے ماتم میں گاتے ہیں جسے فطرت سنتی ہے اور ہنستی ہے اور جس کا نظام زندگی پر مطلق کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔

جب ایک شخص کہتا ہے کہ "میں زندہ رہنا چاہتا ہوں" تو میں چاہتا ہوں کہ وہ یوں کہے کہ "میں با اصول رہنا چاہتا ہوں" دراصل زندگی کا نام اصول ہونا چاہئے اور ہر اصول کا ایک خاص معیار۔

حُسن کاری

اِس بساطِ رنگ و بو پر جس شخص کو بھی مذاقِ سلیم عطا کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی زندگی کے کچھ لمحات "حسن کاری" کے متعلق غور کرنے میں ضرور صرف ہوئے ہوں گے۔ ہم اپنے ہوش و حواس کے ساتھ اس کو نہ سمجھ سکیں۔ یہ دوسری بات ہے ورنہ ہمارے ذہن میں فطری طور پر حسن کاری کے متعلق ایک معیار قائم ہوتا ہے۔ جس کا اظہار ہم اپنی روزانہ زندگی میں کرتے رہتے ہیں۔ "حسن کاری" اور ہماری خواہشات میں ایک ربطِ مسلسل قائم ہے۔ ہماری سوسائٹی ہماری خواہشات کا معیار قائم کرنے میں خاص طور پر اثر انداز ہوتی ہے اور زندگی کے دوسرے مسائل کا حل تلاش کرنے میں بھی معاون ہوتی ہے

کسی بڑے مصنف کا قول ہے کہ اگر تم کسی قوم کی حالت کا صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے یہ معلوم کرو کہ "حسن کاری" کے متعلق اس کے خیالات کیا ہیں۔ دراصل "حسن کاری" کا معیار ہی ایک قوم کو دوسری قوم سے ممتاز کرتا ہے۔ اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے زندگی اپنی چنگاریاں حاصل کرتی ہے۔

میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ شریف النفسی کا ہماری زندگی میں بہت بڑا حصہ ہے۔ شریف النفسی ایک ایسا جذبہ ہے جو ہمیں فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔ اس لئے لازمی طور پر ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو روزانہ زندگی کے واقعات سے وابستہ رکھیں۔ شباب اور شریف النفسی دو علیحدہ علیحدہ چیزیں نہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ آرٹ کو آرٹ کی نظر سے دیکھنا چاہئے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آرٹ کو آرٹ کی نظر سے نہ دیکھو۔ لیکن محض مجاز تک اس کی تخصیص کیوں ہو۔ کیا اس طرح خیالات محدود نہ ہو جائیں گے؟ تم ایک محبوب کی فطرت کی نگارش کرتے ہو۔ تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم آرٹ کو محبوب کی نظر سے دیکھتے ہو۔ محض محبوب ہی تو آرٹ نہیں

پیارے دوست - اگر فطرت کی نگارش ہی مقصود ہے تو انسانی فطرت کو موضوع خیال کیوں نہ بنایا جائے - ؟

حسن کاری کو دوسرے معیار پر بھی یہ کہا جا سکتا ہے - اور وہ اس طرح کہ ہم بیرونی اشیاء کی طرف اپنے رجحان پر نگاہ رکھیں کہ ہماری ذہنیت کیا ہے - ہم کس نقطۂ نظر سے ایک چیز کو دیکھتے ہیں - جب میں شعر کہتا ہوں تو یہ بات ضرور میرے پیش نظر ہوتی ہے کہ میں بلاواسطہ کوئی بات کہنا پسند نہیں کرتا - میں کسی شے کی فطرت کا اظہار نہیں کرتا بلکہ اس مخصوص شے کو موضوع شعر بنا کر اس پر اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہوں میں کیوپڈ ہوں اور مجھے حُسن کی تلاش ہے - مگر میرا ایمان ہے کہ حسن اور محبت کے بغیر کوئی رومان مکمل نہیں ہو سکتا -

کیوپڈ اپنے مرکز پر تیر پھینکتا ہے - میں بھی اشعار کے تیر چلاتا ہوں اس کے تیر مرکز پر جا کر پیوست ہو جاتے ہیں مگر میرے تیر اس مرکز کے اردگرد گھومتے ہیں - یہ ہے "حسن کاری" کے متعلق میرا نظریہ -

شباب کی گوناگوں کیفیات نظر کش ضرور ہوتی ہیں لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ عمر کے اس بہترین حصے کو بزم رنگیں

کی نذر کر دینا چاہئے ۔ عمر کے بہترین حصے تو بہترین مقصدِ حیات میں صرف ہونے چاہئیں ۔ شمعِ محفل بنو ۔ محفل کو زینت دو ۔ اسکا دہواں نہ بنو جو فضا کو مکدّر اور دماغ کو پراگندہ کر کے خود ہی فضا میں گُم ہو جاتا ہے ۔

قادرِ مطلق نے انسان کو جذبات اور احساسات سے بہرہ مند کیا ہے ۔ "حسن کاری" ہماری اندرونی قوتوں کو بروئے کار آنے پر مجبور کرتی ہے ۔ اور یہی سبب ہے کہ شاعر اپنی فطرت کی ترجمانی کرتا ہے ۔ جو شاعر اس سے بے بہرہ ہو وہ حقیقی شاعر نہیں ۔ جب ایک عنوان میرے سامنے آتا ہے تو میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ جذبات اور احساسات سے اپنی فطرت کو نظم میں تحلیل کر دوں تاکہ نظم پڑھنے والے کو میری فطرت کی ذہنی تصویر کا خاکہ معلوم ہو جائے ۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ تصنّع اور "حسن کاری" گویا ایک ہی چیز ہیں ۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ لوگ اپنی خواہشات میں تصنع کیوں روا رکھتے ہیں ۔ جو حسن کارانہ ذہنیت سادگی کے ذریعے سے ظاہر کی جاسکتی ہے ۔ تصنع اس کی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکتا ۔ اس مرحلے پر ایک اور دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے ۔ یعنی اداکاری اور حسن کاری میں کہاں

تک تعلق ہے۔

اداکاری تو ہمارے لئے بقائے حیات کا ذریعہ ہے۔ خیال کیجئے دنیا میں کوئی متنفس بھی ایسا ہے جس میں اداکاری نہ پائی جاتی ہو۔ جب یہ دونوں اس قدر مربوط ہوں تو ایک کا خیال آتے ہی دوسرے کا فوراً ذہن میں آجانا یقینی امر ہے۔ ہمیں اپنی اداکاری میں بھی حسن کاری کو ممزوج رکھنا چاہیئے۔ فرض کیجئے۔ آپ گھر میں رفیقۂ حیات سے پانی مانگتے ہیں۔ وہ جھلا کر اٹھتی ہے۔ اور میلے کچیلے گلاس میں پانی بھر آپ کو دیتی ہے۔ چھوٹا بچہ سامنے آجاتا ہے۔ وہ غصے میں اسے ٹھوکر سے ہٹا دیتی ہے۔ اگر آپ کو حسن کاری کا ذرا سا جذبہ بھی ودیعت کیا گیا ہے تو کیا اس رفیقۂ حیات کی اداکاری کو آپ مستحسن قرار دیں گے اور کیا آپ کی روح اس منظر سے مسرور ہوگی؟ یقیناً نہیں۔ تو آپ کیوں نہیں ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی حسن کاری کی چنگاریاں بھر دیتے؟

ہمارے ذرائع تفریح سے ہی ہمارے حسن کارانہ مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ ہم کھیلوں سے دلچسپی لیتے ہیں۔ ہم سینما اور تھیٹر جاتے ہیں۔

ہم ناول پڑھتے ہیں۔ غرض کہ آجکل ہزارہا ایسے ذرائع موجود ہیں جن سے ہماری دلچسپیوں میں تنوّع پیدا ہوتا رہتا ہے۔ ان میں بھی حسن کاری کے ذریعے سے خوبی پیدا کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ جب ارباب اصلاح نے دیکھا کہ ناول سوسائٹی کا جزو بن چکے ہیں تو انھوں نے اصلاح کو ناول کے پیرایہ میں ڈھال دیا اور اس طرح زہر کو تریاق بنا کر افراد کے لئے بہم پہنچا دیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ملک کی سیرت پر اس کا کتنا اثر ہوا ہوگا۔ اور آج ہم مولانا عبد الحلیم شرر اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کے کس قدر مرہونِ منت ہیں۔

ہمارے ملک کے بعض مصور عریاں تصاویر منصۂ شہود پر لانے کو حسن کاری سمجھتے ہیں۔ کاش انہیں معلوم ہوتا کہ عریانی سے ان کے دماغ کی محنت ہی ضائع نہیں ہوئی بلکہ ملک کے نوجوانوں کے جذبات کے لئے کتنا سامانِ تخریب جمع ہو گیا۔ ان نتائج کے ذمہ دار وہی مصور ہیں جو اس طرح ہلاکت کا سامان مہیا کر رہے ہیں اور جو اپنے طرزِ عمل سے حقیقتاً حسن کاری کی توہین کر رہے ہیں۔

میں نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے بھی سُنا ہے کہ جب کسی قوم کے

زوال کا وقت قریب آجاتا ہے تو اس میں بہت سے شاعر پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح زوال پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے۔ زوال کے وجود کو محض شعرا پر مبنی کر دینا کسی قدر ناانصافی ہے شاعری تو قوموں کو ابھارتی ہے۔ تاریخِ عالم میں ہزارہا ایسے واقعات موجود ہیں جہاں شاعری نے آگ پر تیل کا کام دیا ہے۔ ہمیں یہ کہنا چاہیئے کہ ہمارے شاعروں کا حسن کارانہ نظریہ ہمارے زوال و کمال کا باعث ہوتا ہے۔

مرزا داغ نے نفسیات محبوب کی کتنی ہی اچھی ترجمانی کی ہو۔ لیکن اس سے ہمارے حسن کارانہ نظریے پر کوئی اچھا اثر مرتّب نہیں ہوا اس اسلوب نے ہمیں ترقی کی طرف جانے سے روکا۔ آج بچے بچے کی زبان پر مرزا داغ کے اشعار ہیں۔ اگر ان اشعار کی نوعیت مختلف ہوتی تو ہمارے خیال کا رجحان بھی دوسری طرف ہو جاتا۔ اور ایسی حالت میں ہم کہیں سے کہیں جا پہونچتے۔ ہمارا لباس، ہماری گفتگو۔ ہمارا چال چلن۔ ہمارا دوسروں کے ساتھ برتاؤ غرضکہ ہماری ہر حرکت ہمارے حسن کارانہ نظریے کی وضاحت کرتی ہے (ــــــ) اسٹیونسن اپنی طرزِ تحریر میں حسن کاری کے جذبے کو اسقدر نمایاں کہتا تھا کہ ایک مرتبہ کچھ لکھنے کے بعد اس

میں کئی مرتبہ ترمیم کرتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اگر تم واقعی اپنے ناظرین سامعین۔ حاضرین اور قارئین پر اثر انداز ہونا چاہتے ہو تو اچھے الفاظ استعمال کرو۔ ہم زندگی کے کسی شعبے سے متعلق کیوں نہ ہوں ہمیں چاہئیے کہ ہم اپنی حسن کارانہ ذہنیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں اور اس کا استعمال اس طرح کریں کہ ہماری روح اور ہمارا ضمیر مطمئن رہے۔
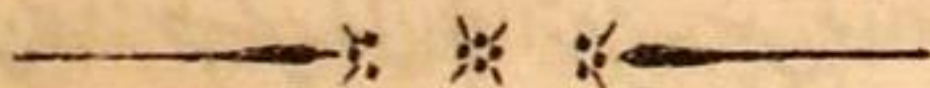
فنِ تعمیر کا تعلق انسان کی فطری ذہنیات پر مبنی ہے۔ کسی قوم میں حسن کاری کا مادہ اس قدر ترقی پر ہوتا ہے کہ وہ اپنی عمرانی اور تہذیبی ومعاشرتی زندگی میں بھی اس جذبے کو نظر انداز نہیں ہونے دیتی۔ کوئی قوم اپنے خیالات اور احساسات میں اس قدر پست ہوتی ہے کہ طرزِ تعمیر تو کیا اس کے افراد اپنی ضروریاتِ زندگی میں بھی کسی ایسی چیز کو شامل نہیں کرتے جو ان کی حسن کاری کے جذبے کی ترجمان ہو سکے۔ تاریخِ عالم میں صرف انہیں اقوام کے نام محفوظ ہیں جن کو حسن کاری سے کچھ واسطہ تھا اور اس کے موضوعات سے دلچسپی تھی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ بساطِ دہر پر کتنی قومیں آئیں اور اپنی رفعت

کا ڈنکا بجا کر موت کی آغوش میں سو گئیں۔ مگر آج کتنی قومیں ہیں جنکا نام من حیث القوم زندہ ہے۔ اور جنکے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے انسانی تہذیب و معاشرت کی عمارت میں اینٹیں چنیں۔

سلطنت کھو دینے کے بعد فنِ تعمیر کا مذاق ہماری قوم کے حسن کاروں کی بے توجہی سے بالکل مفقود ہو چکا ہے اور اب اس مسئلے پر اپنے خیالات کو گردش دینے کے لئے کسی کا ذہن تیار نہیں ہوتا۔ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ لارڈ کرزن ہی کے ذوق کا نتیجہ ہے کہ آجکل ہندوستان میں شاہی عمارات سے دلچسپی کا اظہار کیا جاتا ہے اور طالبانِ فن اس صنف میں معلومات بڑہانے کا ذوق رکھتے ہیں۔ ورنہ ہماری بدقسمتی اور تیرہ بختی تو ہمارے خیالات کو محض شراب و شاہد کی محفلوں تک محدود رکھتی ہے۔ اب اگر کسی میں یہ مذاق ہے تو اس کے لئے صرف اتنا ہی رہ گیا ہے کہ وہ کوچۂ یار کی خاک چھانتے چھانتے کبھی کبھی اس کے گھر کی طرزِ تعمیر پہ بھی نگاہ ڈال لے۔ ورنہ اور تو کوئی موقع نہیں۔ کیا بھی کیا جائے۔ ہمارے حسن کار اور ہماری سوسائٹی کے علم بردار ہمیں اس طرف متوجہ ہونے ہی نہیں دیتے

ہاں اگر خوش قسمتی سے ہمارا دوست حسن کارانہ نگاہ رکھتا ہے۔ تو وہ
اپنے مکان کو بھی طرزِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ بنانا فرض محبوبیت قرار دے گا اور
اس طرح شاید ذوق اور حسنِ نظر کی پذیرائی ہو جائے گی۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہماری قوم سے فنِ تعمیر کا مذاق کیوں مفقود
ہو گیا ہے۔ ورنہ ہمارے اسلاف کا نام تو اس سلسلے میں آج تک
زندہ ہے اور اس کے وجوہ میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے دل
میں حسن کارانہ جذبات ہر وقت موجزن رہتے تھے۔ اسی جذبے کی
خوبی نے انہیں بقائے دوام کا مرتبہ عطا کر دیا۔ اگر آج تاج محل
اعتماد الدولہ۔ سکندرہ۔ اور دوسری شاہی عمارات ہندوستان
میں نہ ہوتیں تو تاریخ اپنی گوناگوں دلچسپیوں کے باوجود ایک خشک چیز
بنکر رہجاتی -اور تاریخ کے طلباء محض بادشاہوں کے نام
اور ان کے زمانے کے واقعات کی تاریخوں کو یاد کرنے میں دماغ صرف
کیا کرتے۔ میں نے تاریخ پڑھتے وقت ہمیشہ اس بات کو محسوس کیا ہے
کہ تاریخ کا وہ دَور میرے لئے یقینی طور پر دلچسپ تھا جس دَور میں حسن کاری
کے جذبے کی وضاحت کرنے کے لئے اس عہد کی قوم کے کچھ نقوش

باقی رہ گئے۔ میں پوچھتا ہوں آج شاہ جہاں اور اکبر وغیرہ کے نام کیوں زبان زد ہیں اور اورنگ زیب عالم گیر کا نام صرف مذہبی جھگڑوں اور فرقہ وارانہ قصوں کے ضمن میں کیوں آتا ہے؟

اگر ہندوستان سے موجودہ قوموں کی بساط دفعتاً اٹھالی جائے تو آنے والی نسلوں کے لئے ہماری کون سی چیز یادگار ہوگی؟ کیا یہ جیل خانے جنمیں انسانیت دفن ہوتی ہے۔ جہاں انسانوں کو کچل کچل کر انسانیت کا جوہر نکالا جاتا ہے؟ کیا یہ عدالتیں جہاں حق و باطل کی جنگِ زرگری ہوتی ہے۔ یہ انبار سنگ و خشت پکار پکار کر کہے گا کہ دیکھو! تمہارے آباؤ اجداد میں حسن کاری کا معیار یہ تھا اور ان کی ذہنیت یہ تھی۔

الٰہی! خفتہ بختوں کے دل میں بجلیاں بھر دے

حسن کاری میں حسب ذیل موضوعات شامل ہیں۔

۱۔ تعمیر ۲۔ سنگ تراشی ۳۔ مصوری ۴۔ موسیقی ۵۔ شاعری

فن تعمیر میں چونکہ مادیات کا حصہ غالب ہوتا ہے۔ اور شاعری کو مادیت سے مطلق تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے ہیگل کے قول کے مطابق

فنِ تعمیر کا حسن کاری میں سب سے کم درجہ ہے اور شاعری کا سب سے
اعلیٰ ۔ چونکہ عمارت میں پتھر ۔ چونا اور لکڑی سے کام لیا جاتا ہے اور
یہ سب مادّی چیزیں ہیں اس لئے سب سے پہلے نگاہ عمارت کی ظاہری
حالت پر جاتی ہے ۔ سورج کی شعاعیں ۔ دھوپ اور سایہ ۔ رنگ
اور فضا وغیرہ فطری طور پر ماہرِ فنِ تعمیر کو بہ پہچانتے ہیں ۔ اور اسے کسی
تصنع وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ گو بظاہر چونے اور پتھر کا امتزاج
کسی خصوصیت کا حامل نہیں ہوتا ۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم
ہوگا کہ ہر عمارت کا طرزِ تعمیر خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہے ۔ مسجدیں ۔ گرجے
اور مندر وغیرہ خاص طور پر قابلِ فکر و غور ہیں ۔ وہ محض اس لئے تعمیر نہیں
کئے گئے کہ اُن میں خدا کی عبادت کی جائے ۔ خدا کی عبادت تو ہر جگہ
ہو سکتی ہے ۔ مذہبی عبادت گاہوں کی طرزِ تعمیر بھی انسان کی روحانی
زندگی کا خاکہ ہوتی ہے ۔ مثلاً گوتھک (Gothic) طرز میں
کلغی آسمان کی جانب اشارہ کرتی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان
کو اپنے خیالات، روحانیات سے متعلق رکھنے چاہئیں ۔ لیکن چونکہ ایک
عمارت میں اس کے ظاہری نقوش بہت زیادہ نمایاں ہوتے ہیں

اس لئے دیکھنے والے کی نگاہ سب سے پہلے اس کی بناوٹ پر جاتی ہے
اور یہ نگاہِ نکتہ رس ہی کا کام ہے کہ وہ اس کی حقیقت تک پہونچ جائے

جب ایک شخص "تاج" میں داخل ہوتا ہے سب سے پہلے اس پر
اس کی فضا اثر انداز ہوتی ہے اس عمارت کو شعرا نے ایک شاہزادی
کے تاج سے تشبیہ دی ہے جو اسے رکھ کر کہیں چلا گیا ہو۔ لیکن بہت
کم ہوں گے جن کی نگاہ اس حقیقت تک پہونچی ہوگی کہ اس فردوسِ
ارضی میں حسن۔ محبت اور صداقت کو دنیاوی پیراہن دے کر بقائے
دوام دی گئی ہے۔ ایک تاج محل ہی پر کیا موقوف ہے۔ ہر عمارت کی یہی
خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ روحانیات کو مادیات کی صورت میں پیش کرے۔

دنیا کی ہر قوم کا طرزِ تعمیر جدا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف
اوقات میں مختلف اقوام پر مختلف خیالات کا غلبہ رہا۔ اٹلی میں چونکہ
سوسائٹی پر انسانی جذبات کی حکومت تھی اس لئے اٹلی کے باشندوں
کی قوتیں ان کے اظہار میں صرف ہوئیں اور آج تک وہ اس میں مشہور
ہیں۔ Tuscany میں مذہب کا غلبہ تھا۔ اس لئے اس کی
عمارات بھی باشندگانِ "ٹسکنی" کے خیالات کا مظہر ہیں۔ رسکن نے

اس ضمن میں بہت کچھ اثر آفریں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ٹاؤن ہال
بریڈفورڈ (Town Hall Bradford) میں
لیکچر دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ عیسائی اپنی مذہبی عمارات کو گوتھک
طرز پر تعمیر کرتے ہیں۔ جس سے ان کی روحانی زندگی پر روشنی پڑتی ہے
لیکن ان کے مکانات وغیرہ میں گوتھک طرز کو ترجیح نہیں دی جاتی
کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اپنی روحانی زندگی کو گرجے کی چاردیواری
تک محدود رکھتے ہیں اور اپنی روزانہ زندگی میں انہیں روحانیات کا
خیال بھی نہیں آتا۔ یونان میں عقل اور طاقت کی خدائی تھی از منۂ وسطیٰ
میں مذہب کی پوجا ہوتی تھی اور زمانۂ حال میں غرور و حسن کی پرستش
ہوتی ہے۔ لیکن رسکن کے قول کے مطابق ایک چوتھا مذہب اور
مسلک اور بھی ہے۔ یعنی دولت اور دھن کی پوجا۔ جسکی نمائش ہم اپنی
زندگی کے ہر شعبے میں کرتے رہتے ہیں یونان نے اپنی حکمت عملی سے طرزِ تعمیر کو اپنے لیے مخصوص
کر لیا۔ آجتک تاریخ میں اسکا نام زریں حروف سے درج ہے۔ از منۂ وسطیٰ میں مذہبی خیالات کیوجہ سے
عمارات میں نجات حاصل کرنیکے خیال کو اہمیت دیگئی۔ اسکے بعد غرور اور حسن کی مظہر وینس کی خوبصورت عمارتیں
ہیں لیکن آجکل ہمارے تمام نظریات دولت کے ماتحت ہیں۔ مکانات، گودام، بینک، بندرگاہ وغیرہ سبکی

طرزِ تعمیر میں روپے کا بیش از بیش خیال رکھا جاتا ہے۔ اور ہمارے تمام
کام محض روپے ہی کی قوت سے طاقت حاصل کرتے ہیں۔ بنگاہِ
حقیقت دیکھا جائے تو آج دنیا بھر میں روپیہ کی پوجا ہو رہی ہے
رسکن سے پوچھا گیا کہ مارکیٹ تعمیر کرنے میں کونسا طرز اختیار کیا جائے
اس نے جواب دیا کہ ہمیں مارکیٹ کے باہر ایک تھیلی کی تصویر بنانی چاہئے
اور ایک ستون جس پر نوٹس اور اشتہار چپاں کئے جاسکیں۔ تاکہ
اس سے ہماری سرمایہ دارانہ ذہنیت پر روشنی پڑے۔ اس سے
انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ازمنۂ قدیم میں بھی دولت کی وقعت کم نہ تھی
لیکن اُن سنہری ایام میں جن میں محض فطرت کی عطا کردہ اشیا ہی
سے ہماری ضروریات پوری ہو جاتی تھیں دولت کو محض ضمنی درجہ
دیا گیا تھا۔ دولت کی دیوی موجود تھی۔ لیکن اس زمانے میں اس کو
وہی درجہ حاصل تھا جو آج کل ہماری رعونت اور بدبختی کی وجہ
سے ہمارے مذاہب کو حاصل ہے یعنی جس طرح آج ہم مذاہب کو
لازمۂ حیات نہیں سمجھتے اسی طرح دولت کی دیوی بھی لازمۂ حیات
نہ سمجھی جاتی تھی۔ ذہنیتوں میں انقلاب ہوا۔ لیکن اس انقلاب نے

بالکل ہی کایا پلٹ دی۔

عجیب واقعہ ہے کہ ایک چیز کی ابتدا دو مختلف مقامات پر ایک ہی ضرورت کے ماتحت ہوتی ہے۔ لیکن زمانے کی رفتار کے ساتھ دونوں کا رخ بدل جاتا ہے۔ اور ہم حیرت سے دیکھتے ہیں کہ دونوں چیزیں جو ایک ہی جگہ سے شروع ہوئی تھیں۔ کہیں سے کہیں جا پہونچیں۔ اور اب یہ شبہ بھی نہیں ہوتا کہ ان کی ابتدا ساتھ ہی ہوئی تھی۔ اس خصوص میں مشرق اور مغرب کا اختلاف ہے۔ مشرق کے فنِ تعمیر کا طرز مغرب سے بالکل جدا ہے۔ جسے آب و ہوا اور مختلف مذاق کی تربیت کی وجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

مسٹر فرگسن کا خیال ہے کہ ہندوستان میں فنِ تعمیر کی حالت کو دیکھتے ہوئے ہمارے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں ہے کہ ہندوستان کی عمارتیں صنعت گری کا واحد نمونہ ہیں جن کی مثال دوسری جگہ ملنا ناممکن ہے۔ ہندو اقوام میں فنِ تعمیر کا بہت زیادہ چرچا رہا ہے۔ اور موجودہ زمانے کے مندر اور ان کی تیرتھ گاہیں اس خیال کی وضاحت کرتی ہیں۔ ہندوؤں میں فنِ تعمیر کی رفتارِ ترقی دیکھنے کے لئے ضروری

ہے کہ ان کی سوسائٹی کی مکمل تاریخ معلوم کی جائے جو ان کے مختلف
اوقات اور مختلف ادوار مذاق پر روشنی ڈالے۔ بدقسمتی سے تاریخ
لکھنے کے ذوق کا فقدان ہندوؤں میں ہمیشہ رہا ہے۔ اور آج تاریخ
کے بعض حصے محض اس لئے تشنہ رہ گئے ہیں کہ ہندوؤں کی قومی روایات
میں ان کا ذکر نہیں۔ یہ تو غیر اقوام ہی کا احسان ہے جنھوں نے مختلف
اوقات میں ہندوستان میں وارد ہو کر مقامی تہذیب و معاشرت
سے بیرونی دنیا کو آگاہ کیا۔

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ گو ہندوؤں کی مقدس
کتابوں میں ان کی مختلف مدارج ترقی کا ذکر ہو لیکن انہیں اپنے آرٹ
کے مطالعہ سے بھی دلچسپی نہ تھی۔ کچھ عرصہ ہوا سنسکرت جیسی معلومات
کے اس قدر ذخائر موجود ہیں محض پنڈتوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئی
تھی۔ وارن ہیسٹنگ، لارڈ کارنوالس اور لارڈ ولزلی اس ضمن
میں شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے اپنی کوششوں سے ہندوستان
کی کلاسیکل زبانوں کی حفاظت کے ذرائع بہم پہونچائے اور بیرونی
اصحاب کو سہولتیں دیں کہ وہ یورپ کو ہندوستان کے آرٹ سے

آگاہ کریں۔

سکندر اعظم کے حملے سے قبل کی طرزِ تعمیر کا حال ابھی تک دنیا کے لئے معمہ ہے۔ البتہ اس کے بعد کے بعض نمونے ایسے موجود ہیں جو اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور سائنس کی مدد سے یہ امتیاز کرنا ہمارے لئے اب دشوار نہیں رہا ہے کہ انکا اسلوبِ تعمیر کیا تھا؟

چین جاپان اور برہما کی طرح ہندوستان کا قدیم طرزِ تعمیر بھی لکڑی سے مزین تھا اور میگس تھنیز کا بیان ہے کہ چندر گپت کا دار السلطنت پاٹلی پتر کی شہر پناہ کی دیوار لکڑی ہی بنی ہوئی تھی اس میں بالترتیب تیر پھینکنے کے لئے سوراخ تھے۔ اس سے آسانی سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ دوسری عمارتیں بھی ایسی ہی ہوں گی۔ چونکہ لکڑی پائیدار نہیں ہوتی اس لئے آج کل ہمارے سامنے اس نمونے کی کوئی عملی مثال موجود نہیں۔

رفتہ رفتہ امتداد زمانہ کے ساتھ لکڑی کا رواج اٹھتا گیا اور اس کی جگہ پتھر نے لے لی۔ اس تدریجی انقلاب کی وجہ غیر ممالک کیساتھ ہندوستان کے تعلقات تھے۔ سکندر اعظم کے حملے کے بعد یونانی ہندوستان

آتے تھے اور ہندوستانی مختلف صورتوں سے غیر ممالک کا سفر کیا کرتے تھے۔ ایرانیوں نے اس صنف میں ترقی کا قدم اٹھایا اور چٹانوں سے کاٹ کر عمارتیں تعمیر کیں۔ ہندوستان کے رؤسا بھی اس سے اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سلوکس کی بیٹی نے جسکی شادی چندر گپت کے ساتھ ہوئی تھی اس باب میں نمایاں خدمت انجام دی ہوگی۔

اس کے بعد اشوک کا زمانہ آیا۔ اور بدھ مذہب کی ترویج بڑے پیمانے پر ہونے لگی۔ ہندوستان اور غیر ممالک کا سلسلۂ ربط و اتحاد بڑھا اور اشوک نے مذہبی تبلیغی جماعتیں مختلف مقامات پر بھیجیں جنہوں نے بدھ مذہب کی تبلیغ کی۔ اس کی وجہ سے پتھر کی عمارات کو اور زیادہ تقویت پہونچی وہ بڑے بڑے ستون جنمیں بدھ مذہب کی تعلیم درج ہے اسکی پوری طرح وضاحت کرتے ہیں۔

خاندانِ گپت کے زمانے سے گپت طرزِ تعمیر کو رواج ہوا۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس طرزِ تعمیر نے بھی صنعت کاری کا اعلیٰ نمونہ پایا تھا۔ اس کے بعد غاروں میں مندر گندھارا کی یادگار ہیں۔ کشمیری

طرزِ تعمیر، کنارا میں جین مندر۔ ڈراویڈین طرزِ تعمیر۔ چالوکیہ۔ انڈو آرین طرزِ تعمیر کے ذکر سے قدیم ہندوستان کی تاریخ روشن ہے۔

اسلام کا دور فنِ تعمیر کے اعتبار سے بہت پُر عظمت اور دلچسپ تھا ہندوستان میں بھی مسلمان اپنے مخصوص طرزِ تعمیر کے ساتھ داخل ہوئے تھے لیکن مقامی فضا نے غیر معمولی طور پر ان پر اپنا اثر کیا۔ یہ اثر اس وجہ سے اور بھی نمایاں ہوا کہ ہندوستان کے معمار ان عمارات کے بنانے کے وقت بکثرت موجود تھے۔ مقامی اثرات کے اثر انداز ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بعض مساجد کی مندروں کے باقی ماندہ حصص سے تعمیر ہوئی تھی جیسے کہ اجمیر شریف کی ایک مسجد اسلئے ان سے وہ طرزِ تعمیر جدا نہیں کیا جا سکتا تھا جس پر ان کی اساس رکھی گئی تھی۔

ہندوستان میں مختلف اسلامی خاندانوں نے حکومت کی۔ جن میں سے ہر ایک کی خصوصیات الگ الگ نظر آ سکتی ہیں۔ غلام خاندان کی عمارات میں صنعت کاری بہت دکھائی گئی ہے مساجد وغیرہ سے اس کی پوری طرح تصدیق ہوتی ہے۔ قطب مینار جسے التمش نے ۱۲۳۱ء میں تعمیر کیا تھا اپنی نوعیت کے لحاظ سے

بے نظیر ہے۔

لیکن پٹھانوں نے اپنے طرزِ تعمیر کو بہت سادہ بنا دیا فیروز شاہ تغلق کے زمانے کے محلات۔ حمام۔ مساجد قلعے۔ مقبرے۔ دارالعلوم اور ہر نوعیت کی ذاتی اور پبلک عمارات سادہ طرز تعمیر کے لحاظ سے خصوصیت رکھتی ہیں۔

فن تعمیر کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی تقلید سے برأت حاصل کر لی تھی اور ان کو اب معمار ایسے ملنے لگے تھے جو ان کی عمارات میں محرابیں بہت عمدگی کے ساتھ بنا سکتے تھے۔ چنانچہ شیر شاہ سوری کے مقبرے میں جو ایک تالاب میں تعمیر کیا گیا ہے یہ امتیاز خصوصیت کے ساتھ نظر آتا ہے۔

چودھویں صدی عیسوی میں پٹھانوں کے مقابر کی طرح ان کی مساجد بھی ممتاز تھیں۔ اور سادگی میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھیں۔ رفتہ رفتہ دہلیتوں میں پھر انقلاب شروع ہوا اور مینا کاری اور صنعت کاری زیادہ پسند کی جانے لگی۔ سنگ مرمر کا استعمال کیا جانے لگا۔ اور مسٹر فرگسن کے قول کے مطابق یہ آخری درجہ دنیا کے فن تعمیر کی اکملیت کا درجہ تھا۔

مشرقی طرزِ تعمیر اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ شاہانِ مشرق کی عمارتوں میں ہندوانہ طرزِ تعمیر کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد شاہانِ مالوہ۔ بنگال۔ گجرات۔ گلبرگہ اور بیدر۔ بیجاپور وغیرہ کی عمارتیں مقامی حیثیت سے سب الگ الگ خصوصیات کی حامل ہیں۔

مغلیہ طرزِ تعمیر نقاشی کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ ایک انگریز سیاح کا قول ہے کہ مغل اپنی عمارات جنات کی طرح شروع کرتے تھے اور جوہریوں کی طرح پایۂ اختتام کو پہونچاتے تھے۔ یہی سیاح ایک دوسری جگہ کہتا ہے کہ گو اکبر ہندوستان میں حکومت کر رہا تھا۔ لیکن اس کا ذہن اپنے جدِ امجد تیمور کے خیموں میں گردش کر رہا تھا۔ مقامی طور پر گو اسنے عمارتیں صناعی کے اعلیٰ نمونے پر تعمیر کیں لیکن پھر بھی وہ اپنی عمارتوں سے اپنی اسلافی خصوصیات کا اخراج نہ کر سکا۔

اکبرِ اعظم کے عہد میں مغلیہ طرزِ تعمیر نے نمایاں ترقی کی۔ اس کے عہد میں حسن کارانہ فطرت نمو پا رہی تھی اس کے عہدِ حکومت سے ایک نئے طرزِ تعمیر کی بنیاد پڑی جسکو عرفِ عام میں قومی یا ہندوستانی طرز کہا جا سکتا ہے۔ اس نے بلا تفریق و امتیاز اپنی عمارتوں میں اسلامی

خوبیوں کے ساتھ ساتھ ہندوانہ خوبیوں کا امتزاج بھی پیدا کر لیا۔

لیکن اس کی وفات کے بعد طرزِ تعمیر میں پھر انقلاب ہوا۔ جہانگیر نے لاہور کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اور لاہور میں اس نے جو جامع مسجد تعمیر کی وہ ایرانی طرز پر تھی۔ جہانگیر کے عہد ہی میں اعتماد الدولہ (آگرہ) کی تعمیر ہوئی اور جن اصحاب نے اس عجوبۂ روزگار عمارت کا صحیح طور پر مطالعہ کیا ہے انہیں معلوم ہوگا کہ کام میں کس قدر باریکی اور مینا کاری دکھائی گئی ہے۔

شاہ جہاں کے عہد میں پھر ایک نیا انقلاب ہوا۔ لطافت اور نزاکتِ خیال نے زیادہ غلبہ حاصل کر لیا۔ تاج محل شاہ جہاں کے خوابِ محبت ہی کی تعبیر ہے۔ جامع مسجد دہلی اور موتی مسجد (قلعۂ آگرہ میں) اپنے طرز کا مخصوص نمونہ ہیں۔ شاہ جہاں کے عہد کو مغلیہ سلطنت کے سنہری ایام سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ اس زمانے میں فنِ تعمیر اپنی انتہائی رفعت پر تھا۔

شاہجہاں کے بعد فنِ تعمیر میں زوال شروع ہو گیا۔ اور نگ زیب نے حسن کارانہ مذاق کے فقدان کی وجہ سے اس طرف کچھ زیادہ توجہ

نہ دی۔ اورنگ آباد میں اس کی بیوی کا مقبرہ تاج محل کے طرز پر تعمیر کیا گیا لیکن اسمیں بھی یہ بات اپنی پوری قوت کے ساتھ موجود ہے کہ فنِ تعمیر روبہ زوال تھا۔

گو بظاہر فنِ تعمیر ایک خشک موضوع معلوم ہوتا ہے مگر اس میں ایسی دلچسپیاں موجود ہیں جو ہماری تمام ذہنی کاوشوں کو دور کر سکتی ہیں اور ہم کو ایسے عالم میں پہونچا دیتی ہیں جہاں ہمارے ذوق کی پذیرائی کے لئے قدم قدم پر امکانات ہیں۔ تاج صرف ایک شعر اور خوابِ جامِ مرینہ پاشاہ جہاں کے خوابِ محبت کی تعبیر ہی نہیں بلکہ یہ حسن کاری کا بھی ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

اب تک ہم نے تاج کو شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ اب ہمیں چاہئے کہ اسے حسن کارانہ نگاہ سے بھی دیکھیں اور اس کی خوبیاں معلوم کریں۔

اداکاری

اداکاری حرکات کا نام ہے۔ ذی روح اشیا اپنی زندگی میں حرکت سے کام لیتی ہیں۔ اگر انہیں حرکات کو مرتب کر لیا جائے تو مجموعی حیثیت سے ان کو اداکاری کہا جا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اداکاری ہمارے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ نئی چیز یہ ہے کہ اس کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم اس سے بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ اور بدقسمتی سے تھیٹر اور سینما تک اس کا دائرہ محدود سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بزرگ ہمیں تھیٹر اور سینما سے محض اس لئے روکتے ہیں کہ ان سے انسان اسراف پسند ہو جاتا ہے اور اس طرح اداکاری سے وابستگی رکھنے والے سوسائٹی سے الگ ایک شیطانی روح تصور کئے جاتے ہیں۔ ہمارے

بزرگوں کا خیال ہے کہ تھیٹر اور سینما موجودہ سوسائٹی کے لئے ایک لعنت ہیں، ——— ایک زہریلا کیڑا جو ہماری خوشحالی کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔

ہم یقیناً اُن ڈراموں کو بُرا کہہ سکتے ہیں جو ہماری سوسائٹی کے اخلاق پر بُرا اثر ڈالتے ہیں۔ اور ہماری اخلاقی حالت تباہ کرتے ہیں۔ لیکن نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے ہمارے دائرۂ بحث میں ان ڈراموں کے اثرات نہ ہونے چاہئیں۔ یہ ہمارے ڈرامہ نویسوں کا کام ہے کہ وہ ایسے ڈرامے ہمارے سامنے پیش کریں جو انسانی سوسائٹی کی اصلاح میں معاون ہوں ہمیں تو یہ دیکھنا چاہیے کہ ایک ڈاکو نے جو ایک معصوم بچی کو قتل کر رہا تھا کس طرح اپنا بیرحمانہ پارٹ ادا کیا۔ شقاوتِ قلب کے مظاہر میں اس کے چہرے پر کیا کیا کیفیات طاری ہوئیں اور اس معصوم بچی نے کس طرح درد بھری نگاہوں سے قاتل کی طرف دیکھا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اداکاری میں ایسے جذبات کا اظہار ہونا چاہیے جو شرافتِ نفس کو کسی پہلو سے نظر انداز نہ ہونے دیں اور یہی وجہ ہے کہ سینما میں ایکٹروں کی بوسہ بازی کے خلاف بعض اصلاح پسند حضرات ایک عرصے سے

جہاد کر رہے ہیں اور ان کی آواز سے متاثر ہو کر بعض فلم کمپنیوں نے اس
اداکاری کو اپنے لائحہ عمل سے خارج کر دیا ہے۔

زندگی جذبات کا نام ہے۔ جب ہم ایک ایسا شعر سُنتے ہیں جو،
ہماری روح پر براہ راست اثر انداز ہو تو ایسے عالم میں ہم محسوس کرتے
ہیں کہ ہمارے جذبات کی فضا میں ایک خلا واقع ہو گئی ہے۔ اور جبتک
ہم اس شعر کو بار بار نہ پڑھ لیں یا اس سے بہتر شعر نہ کہہ لیں یہ خلائے روح
پُر سکون نہیں ہوتی۔ جب تم اپنے جذبات کو دبا دینا چاہو یا اُن کو فرو
کرنا چاہو تو شعر کہنے بیٹھ جاؤ۔ اس طرح تم اطمینان حاصل کر لو گے۔ حقیقی
حسن کاری کی نمود کا یہی وقت ہوتا ہے اور ایسے عالم میں جو کچھ حسن کاری
کے لئے کیا جائے گا وہ اپنی نوعیت کی بہترین چیز ہو گی۔ جہاں ایسی عالم
میں ایک بہترین شعر کہا جاسکتا ہے وہاں جذبات سے بھری ہوئی
اداکاری بھی بہترین چیز ثابت ہوتی ہے

انسان پر مختلف اوقات میں مختلف کیفیات طاری ہوتی ہیں کسی
وقت وہ پژمردہ خاطر ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز پر اُسے اداسی چھائی
ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ طبیعت تخریب کی طرف مائل ہوتی ہے۔ یہی جی

چاہتا ہے کہ دنیا کی تمام چیزوں کو ٹھکرا دے اور کسی ایسی فضائے نو میں حیات کی تعمیر ہو جہاں روح کو پوری طرح سکون اور اطمینان حاصل ہو۔ تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ بعض وقت انسان پُرنشاط نظر آتا ہے اس وقت ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اردگرد کی اشیا ایک رُوحانی لبادے میں ملبوس ہیں۔ ہر چیز سرسبز اور شاداب معلوم ہوتی ہے۔ ایسے عالم میں اگر کسی حقیقی دوست کی معیت حاصل ہو جائے تو حسن کارانہ فطرت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ ہم اس کے پہلو میں ایسی گدگدی کریں کہ قیامت تک اس کی ہنسی نہ رُکے اور ہم بھی اس کی اس کیفیت میں ایسے محو ہو جائیں کہ ہماری مسرّت ہمارے دوست پر منعکس ہونے لگے اور ہم اس کو خوشی اور سرمستی کا مجسمہ قرار دے دیں۔

ان دونوں کیفیات سے جو مختلف اعمال یا حرکات وجود میں آتے ہیں ان ہی کا نام اداکاری ہے۔ ہم میں سے کوئی شخص ان حالتوں سے خالی نہیں۔ کامیڈی اور ٹریجڈی انہیں دو کیفیات کے تسلسل سے ترتیب پاتی ہیں اور انسان بالآخر ٹریجیڈی کی طرف مائل ہوتا ہے جو اس کی المیت کا آخری درجہ ہے۔

ہر حسن کار کی پیدا کردہ شے کسی خاص خیال کی مظہر ہوتی ہے اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر شے کسی خاص حرکت یا ادا کی وضاحت کرتی ہے۔ ایک مصور اپنی تصویر میں ایک ادا کی تصویر کھینچتا ہے۔ اسی طرح ایک شاعر بھی شعر میں کسی خاص جذبے کو متکلم کرتا ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ لبعد الذکر کا شعر سننے کے بعد ہماری روح میں ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ شاعر نے شعر میں اپنی روح کو تحلیل کر دیا ہے۔ گو تصویر ایک غیر جاندار چیز ہے لیکن ایک جذباتی انسان تصویر سے بھی اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کہا جا سکتا ہے کہ شاعری میں اداکاری کے بجائے محاکات کو زیادہ دخل ہونا چاہئے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے اداکاری اور محاکات میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ محاکات کہتے ہیں کسی واقعے کی صحیح تصویر بنا کر رکھدینا اور اداکاری نام ہے ذہنی تربیت کا جو لطیف اور موثر حرکات پیدا کرنے کی موجب ہوتی ہے۔ میں نے شاعری میں اداکاری کو ہاتھ وغیرہ سے وابستہ نہیں کیا۔ وہ تو الفاظ ہی قلم سے ایسے نکلتے

ہیں کہ ایک شے کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس صورت میں شعر
اس میں جان ڈال دیتا ہے۔ یہی اداکاری اور محاکات میں فرق ہے
اس کو اور زیادہ صاف طور پر سمجھنے کے لئے محاکات کو ایک جامد ہیرا
تصور کر لیجئے اور اداکاری کو ایک گوہرِ رقصاں، محاکات کو موجِ بحر سمجھ
لیجئے اور اداکاری کو اس موج کا اضطراب۔

ایک اداکار یا ایکٹر کو بہروپیا کہا جاتا ہے۔ تصنع اس میں
کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ اس کا حسن اور تمثیل کاری محض اسٹیج تک
محدود ہوتی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ افلاطون نے جہاں اپنی جمہوریت
سے شعرا کو نکال دینے کا مشورہ دیا ہے وہاں اداکار کی مٹی بھی
پلید کی ہے محض اس لئے کہ وہ اپنے ہر کام میں تصنع اور نمائش سے
کام لیتا ہے۔ ممکن ہے ایکٹر ہماری سوسائٹی کے لئے مفید نہ ہوں۔ لیکن
یہ بات صرف ان کے پیشے تک ہی محدود ہے۔ میرا مطلب اداکاری
پیدا کرنے سے اسٹیج کی اداکاری نہیں بلکہ میں دنیا کو اسٹیج یقین
کرکے انسان کو حسن اداکا درس دینا چاہتا ہوں۔ اپنے جذبات اور
احساسات کو نمایاں کرنے کے لئے یقینی طور پر ہمیں اداکاری کی ضرورت

ہے اور اگر اس کو منظم اور شائستہ کر لیجئے تو ایک مہذب سوسائٹی کی تمام ضروریات پوری ہو سکتی ہیں جن کا تعلق فنونِ لطیفہ سے ہے۔ اور میرے خیال میں تو اداکاری صداقت کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔

عادات واطوار کا ہماری تہذیب وتمدن میں بہت بڑا درجہ ہے ایک شائستہ مزاج نوجوان جب سڑک سے گذرے گا تو اس کی حرکات وسکنات اس کو ممتاز انسان ثابت کریں گی۔ لیکن ایک غیر شائستہ اور غیر مہذب انسان کی حرکات اس کی بدطینی کی مظہر ہوں گی ہماری پبلک لائف ہماری پرائیویٹ زندگی کا آئینہ ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک شخص کی صورت ہی اس کی شرافتِ نفس پر مہر تصدیق ثبت کر دیتی ہے۔ حسن کاری انسان کی اندرونی قوتوں کو منظرِ عام پر لاتی ہے۔ بعض وقت یہ قوت اشعار کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور بعض دفعہ اداکاری کی۔

ایک شاعر یا حسن کار کا کام اس کی فطرت کا اظہار کرتا ہے۔

میں جب شاعر کا کوئی شعر یا نظم پڑھتا ہوں میرے ذہن میں اس شاعر کا فطری کردار مرتسم ہو جاتا ہے۔ میں شاعر کو محض مجسمے کی صورت میں

نہیں دیکھتا بلکہ متحرک دیکھتا ہوں

کیٹس مجھے سیاہ لبادے میں ملبوس نظر آتا ہے میں اس کو ہر وقت متبسّم دیکھتا ہوں۔ اُس کی پہلی نگاہ ہر چیز کے خارجی پہلو سے ٹکراتی ہے اور پھر وہ حسن کی تلاش میں سرگرم ہو جاتا ہے۔ عورت کے ذکر سے وہ بہت دلچسپی لیتا ہے مگر تنہائی میں اس کا دل غم سے لبریز معلوم ہوتا ہے اس کے دماغ میں "پریاں اور دیو" بیک وقت ناچتے نظر آتے ہیں جب اسے اپنی مشکلات یاد آتی ہیں تو وہ اپنا غم غلط کرنے کے لئے محفل میں آتا ہے اور یہاں کی چہل پہل اس کے تمام دکھ بھلا دیتی ہے۔

ورڈس ورتھ دنیا سے الگ سبزہ زار فطرت میں مصروف مشاہدہ نظر آتا ہے۔ وہ پھولوں میں، کلیوں میں، چاند میں تاروں میں، بھیڑوں کے گلّے میں غرض کہ ہر جگہ روحانیت کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن کوئی چیز اُسے مطمئن نہیں کر سکتی وہ اس عالم سے گریزاں اور مایوس ہو کر بھاگنا چاہتا ہے مگر پھر کوئی خیال اسے واپس لے آتا ہے۔ اور وہ پھر بدستور تلاشِ روحانیت میں مصروف ہو جاتا ہے۔

ٹیگور مجھے ایک مہذب جن نظر آتا ہے اور میں اپنے ذہن میں

اس کی کوئی ایک صورت قائم نہیں کر سکتا کبھی تو وہ مجھ کو ایک بچہ معلوم ہوتا ہے جو پھولوں اور مٹی کے کھلونوں سے کھیل رہا ہو۔ کبھی میں اس کو ایک جوان کی طرح درس آزادی دیتا ہوا دیکھتا ہوں اور کبھی ایک معمر راہب کی طرح جو اپنی کمر جھکائے ہوئے ایک گرجے میں مصروف عبادت ہو۔

اقبال ایک متفکر فلسفی کی طرح اپنی کرسی پر سر گشتہ تخیل ہے۔ اس کے ایوان کے پیچھے ایک ہجوم ہے۔ وہ دریچے تک آتا ہے اور اس ہجوم کو ایک پیام دے کر واپس چلا جاتا ہے اور پھر اپنے تخیل کی گہرائیوں میں کھو جاتا ہے۔ وہ گویا پردۂ فانوس (Chimney Corner) سے دنیا کو دیکھ رہا ہے اور وہیں پیام دے رہا ہے۔

سیماب ایک آتش نوا شاعر ہے۔ حوادث و افکار نے اسے کافی فکر و غور کا موقع نہیں دیا۔ اس کی نگاہ آنے والے واقعات کا مشاہدہ کرتی ہے۔ وہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا معلوم ہوتا ہے جہاں کبھی وہ اپنے سوز سے ساری دنیا کو پھونک دینا اور کبھی اپنے صور سے دنیا کی سرد فضاؤں میں زندگی کی لہر دوڑانا چاہتا ہے اس کی

صدا میں شوکت اور نوا میں الہام کی گونج سنائی دیتی ہے

جوش کا تصور کرتے ہی میں اپنے ذہن میں ایک اُبلتا ہوا چشمہ محسوس کرتا ہوں اس کے سامنے آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور وہ اپنے نفسِ گرم سے انہیں اور زیادہ بھڑکانا چاہتا ہے۔ وہ ایک غضبناک اور تندخو شیر کی طرح ہر میدان میں شور آفریں اور بلند بانگ نظر آتا ہے اس لئے لالہ زارِ حسن ہو یا کارزارِ سیاست' ہر جگہ اس کی آواز میں ایک للکار اور ایک انتباہ نمایاں ہے وہ کسی شے سے متسلی معلوم نہیں ہوتا۔ اور یہی سبب ہے کہ میں اس کا کلام پڑھنے کے بعد سکون کا فقدان محسوس کرتا ہوں۔

شعر و شاعر

شعر ایک اضطراری کیفیت ہے الفاظ اور زبان کی قید سے آزاد ایک جذبۂ روحانی ہے جس پر دُنیا کی غلط انگاریوں نے الفاظ کا ملمع چڑھا کر مادیت کے سانچے میں ڈھالنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ میری نگاہ میں ایک دوشیزہ کی انگڑائی اور شاخِ گل کا لچکنا بھی ایک شعر ہے۔ جسے نگاہ پڑھتی ہے اور روح سُنتی ہے۔

جب میں کسی شاداب اور پُرسکوت ماحول میں صَرفِ خرام ہوتا ہوں تو میرا جی یہ نہیں چاہتا کہ میں اس کے تاثرات کو رنگین الفاظ میں تبدیل کرکے دنیا کو اس سے متاثر کردوں۔ بلکہ وہ منظر خود ایک مرتب شعر بن کر اس فضا میں گونجتا ہے اور پھر اُسی فضا میں

گم ہو جاتا ہے۔ گم نہیں ہو جاتا بلکہ تمام فضا مجھے ایک شعر میں مبدل نظر آتی ہے۔ ایک ایسے شعر میں جو فضا اور دماغ پر بیک وقت مرتسم ہو کر مجھے متکیف کر رہا ہو۔

کچھ دیر کے بعد میں وہاں سے چلا جاتا ہوں۔ ایک الفاظ پرست شاعر آتا ہے اور اپنے باطل و خود ساختہ الفاظ میں اس منظر کی ایک ناقص تصویر کھینچ کر لے جاتا ہے۔ اسے ایک جھوٹی عشرت ہوتی ہے۔ مگر ——— وہ منظر اپنی تمام معصومیتوں کیساتھ بدستور ایک الہام، ایک شعر اور ایک آسمانی موسیقی کی طرح اپنی جگہ پر باقی اور محفوظ رہتا ہے۔ میری فطرت کے راز دار یہی فطری مناظر ہیں اور انکا مطالعہ گویا میری فطرت کا مطالعہ ہے۔

میں فطرت کا شاگرد ہوں۔ فطرت ایک پیکرِ محبت میں پنہاں ہو کر مجھے درس دیتی ہے۔ جب میرا سازِ دل الہام سے لبریز ہو جاتا ہے تو اس سے نغمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ دُنیا انہیں میرے نغمے سمجھ کر خوش ہوتی ہے اور میں اپنے نغموں کی حقیقت سمجھ کر صرف مُسکرا دیتا ہوں۔

شعر فی الحقیقت اُن تمام کیفیات کا متحمل و حامل نہیں ہو سکتا جو شاعر کے ذہن رسا میں سیلانِ روح سے پیدا ہوتی ہیں۔ بلکہ ان روحانی کیفیات کا ایک عکسِ ناتمام ہوتا ہے جنھیں شاعر اپنے شعر میں جذب کرنا چاہتا ہے۔ ایک اچھے شاعر کے تاثرات و جذبات کے متعلق یہ خیال قائم کرنا ناممکن ہے کہ اس نے کیا کہا؛ البتہ سخن فہم طبیعتیں شاعر کے خیالات کو استدراک کی سیڑھی بنا کر اگر مرکزِ حقیقت پر پہونچنا چاہیں تو یہ ان کی ذاتی قوت کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

در اصل شعر ایک ایسی موج ہے جو ہلکے ترنم کے ساتھ مسلسل بہی چلی جا رہی ہو۔ ایک ایسی آواز ہے جو پھولوں کی پنکھڑیوں پر شبنم کے گرنے سے پچھلی رات کو پیدا ہوئی ہو۔ شعر ایک قدرتی سمندر ہے جو دشتِ مادیات میں موجیں لیتا ہے۔ شعر اندھیری رات میں تاروں کے ٹوٹنے کی روشن صدا ہے۔ شعر نسیم صبح کے جھونکوں میں ایک بجھتی ہوئی سی دھندلی شمع ہے۔ جو کبھی بجھ نہیں سکتی۔ شعر کسی نہر میں حُسنِ ماہتاب کی ایک اٹھتی ہوئی سی ضیا کہا جا سکتا ہے جو کبھی پُرسکون اور قائم النظر نہیں رہ سکتی۔ شعر ایک نکہت ہے جسے کوئی جھو

نہیں سکتا۔ ایک غیر فانی لذت ہے جسے کوئی چکھ نہیں سکتا۔ اور ایک ایسی محسوس خوبصورتی ہے جسے نگاہِ ظاہر دیکھ نہیں سکتی۔

شعر کیفیاتِ ظاہری و باطنی کا ایک ایسا ہی مجموعہ ہے جس کا تجزیہ ناممکن ہے۔ ایک ایسا نغمہ ہے۔ جس کی کوئی دُھن قائم نہیں کی جا سکتی۔ ایک ایسی روحانی نعمت ہے جو صرف روح کی سیرابی کے لئے دماغِ انساں کو ودیعت کی گئی ہے۔ نہ اس لئے کہ اس کی لذتوں، ترکیبوں اجزائی کیفیتوں اور ماہیتوں پر تبصرہ کیا جائے۔

شاعری کیلئے کسی زبان کی قید نہیں۔ فطرتِ خود شاعر کی زبان ہے۔ روزمرہ اور محاورے کی اُلجھنوں میں پڑنا ایک ماہرِ ادب اور مصلحِ زبان کا کام ہے نہ کہ شاعر کا۔ شاعر کے لئے یہ بات دیکھنے کی نہیں ہے کہ کسی نے اپنے شعر میں کیا لفظ استعمال کیا ہے اور روزمرہ اور محاورے میں اس کا استعمال کس حد تک جائز ہے۔ شاعر کو تو یہ دیکھنا چاہئیے کہ شعر میں کیا جذبہ کار فرما ہے اور وہ کس تاثر کے ماتحت کہا گیا ہے۔ علم ادب، صرف و نحو اور علم بیان کو دار العلوم کی چار دیواری میں مقید کردو۔ شاعر کے سامنے ان کا ذکر نہ کرو اس لئے کہ وہ روحانی

نغموں کی دُھن میں سرشار ہے۔

تم کہتے ہو شاعری کے لئے موزونیت طبع کی ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں۔ شاعر کو محض جذباتی ہونا چاہیئے۔ تم شعر کو قافیہ اور ردیف کی قیود میں مقید کرتے ہو میں کہتا ہوں۔ شاعری نثر میں بھی کی جا سکتی ہے۔ کارلائل کے الفاظ میں تو وہ شخص بھی شاعر سے کم درجہ نہیں رکھتا جو شعر کی حقیقت سے واقف ہے۔ اور شعر سُن کر اس کی روح میں ایک وجدانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

حقیقی شاعر ظاہری دُنیا سے کچھ غرض نہیں رکھتا۔ زندگی کے رسم و رواج سے اس کو کچھ واسطہ نہیں۔ وہ اپنے جذبات اور احساسات میں گم رہتا ہے۔ اور اپنے تاثرات سے فضا کو گردش دیتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک شاعر اپنے دل سے باتیں کرتا ہے۔ دوسروں کو مخاطب نہیں کرتا۔ شاعر کے دل میں چونکہ انسانیت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے دل سے جو نغمہ پھوٹتا ہے وہ انسانیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور انسان شاعر کے جذبات اور احساسات کو سُن کر یہ سمجھتا ہے کہ گویا شاعر اس کے خیالات کی پذیرائی کر رہا ہے۔

دُنیا میں ہر انسان کو جُدا جُدا فطرت ودیعت کی گئی ہے۔ شاعر کی فطرت بھی سب سے علیحدہ ہوتی ہے اور شاعر اپنے اشعار کے ذریعے اپنی فطرت کا اظہار کرتا ہے۔ ہر شعر شاعر کی روحانی قوتوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ میں شاعر کو اس کے شعر میں دیکھ لیتا ہوں۔ تعجب ہے کہ ہم روزانہ زندگی میں اپنے راز اپنے احباب سے چھپاتے ہیں مگر جب شعر کہنے بیٹھتے ہیں تو وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جن سے واقف ہوجانا لوگوں کے لئے ہمارے تمام راز معلوم کر لینا ہے۔

ظاہر بین لوگ شاعر کو نہیں سمجھ سکتے۔ صرف روزانہ زندگی میں اس کے اعمال دیکھ کر اس کی فطرت کے متعلق خیال قائم کر لئے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ فطرت شناسی کے ساتھ ظلم ہے۔ شاعر کبھی بُرا نہیں ہوتا۔ شعر بذات خود اپنی فطرت کا اظہار کرتا ہے۔ بعض شعرا اپنے کلام میں اپنی شخصیت کو نمایاں رکھتے ہیں۔ شعر خود کہہ دیتا ہے کہ میں فلاں شخص کے احساسات اور جذبات کا آئینہ ہوں۔ اگر ہماری فطرت کی نیکی کے ساتھ ہماری عملی زندگی بھی نیک ہے تو اس صورت میں شعر ہی شاعر ہے اور شاعر ہی شعر۔ ہماری شاعری کی بیک گراونڈ

ہماری شخصیت ہونی چاہئیے۔ اگر کوئی شخص ہمارے اشعار نہیں سمجھ سکتا تو وہ ہماری طرف رجوع کرے گا۔ ہماری شخصیت اتنی استوار ہونی چاہئیے کہ جب وہ ہماری طرف رجوع کرے تو ہم اس کا بوجھ سنبھال سکیں۔ ہمیں خود شعر بن جانا چاہئیے۔

ایک حقیقی شاعر کی فطرت اور شخصیت امتیازی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ وہ جب تک زندہ ہے اپنے کیرکٹر سے اپنے ماحول کی فضا کو متحرک کرتا رہتا ہے۔ لیکن اگر اس نے اپنی شاعری اور کیرکٹر کو ایک سطح پر لاکر ہموار کردیا ہے تو اس کے مرنے کے بعد بھی اُسکا کیرکٹر اس کی شاعری کی طرح زندہ جاوید رہے گا۔

حقیقی شاعر کو اس کا نصب العین بتانے کی ضرورت نہیں وہ خود اور فطرتاً جانتا ہے کہ کارزارِ حیات میں فطرت نے اُسے کن فرائض کا امین بنا کر بھیجا ہے۔ اس کی ساری زندگی اُس کے مخصوص نصب العین کی تکمیل میں صرف ہوجاتی ہے اور اس کے مرنے کے بعد بھی کائناتِ شعر اس کے نغموں کی صداسے گونجتی رہتی ہے۔ اسی اعتبار سے شاعر کو پیغمبر کہتے ہیں۔ الہام اس کی روح پر وحی اس کے

دماغ پر اور القا اس کے دل پر نازل ہوتا ہے۔ وہ باقاعدہ نبوت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ لیکن اس کا ہر شعر روحانیات کا ترجمان اور پیامی ہوتا ہے۔

جب تمہاری روح مادّی دُنیا کی کشمکشوں سے دبی ہوئی ہو۔ جب تمہاری روحانیت غمِ روزگار سے کچل دی گئی ہو اس وقت کسی حقیقی شاعر کے پاس جاؤ۔ اور اس سے کہو کہ وہ اپنے دل پر اُترتے ہوئے الہامی نغمے تمہارے سامنے انسانی جذبات کے پردے میں چھیڑے تم اس کے حقیقی نغموں سے سرشار و سرخوش ہو جاؤ گے۔ اور وہ تمہیں دُنیا کے انتشار سے بچا کر روحانیات کی امن گاہ میں محفوظ کر دے گا۔

شعر جس میں روح کی لطافت، اور الہام کی تازگی ہو، جس کے قلم اور زبان سے نکل جائے اُسے دُنیا شاعر تسلیم کر لیتی ہے ورنہ یوں تو اس ہنگامہ پندار میں جس طرح ہر انسان، تدبرّ، عقل اور عظمت کا دعویدار ہے۔ اسی طرح ہر وہ شخص جو چار لفظ آگے پیچھے رکھ کر شعر بنا سکتا ہے۔ شاعر کہلائے جانے کا مستحق ہے

مگر آہ —— ہر شخص شاعر کہاں!

جس طرح ایک پیغمبر اپنی تعلیم و پیام کے اثر سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح ایک شاعر بھی اپنے پیام و کلام سے دریافت کیا جاتا ہے —— شاعر کو سمجھنے سے پہلے اُس کے شعر کو سمجھو۔ شاعر کے عرفان و ادراک سے پہلے اُن کے شعر کا ادراک کرو۔ اگر کوئی شعر حقیقت میں تمھاری روح سے مس ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شعر فی الحقیقت تمھارے دل کو حرکت دے کر تمھارے دماغ کو متاثر کر سکتا ہے۔ اگر کسی شعر سے تمھاری کیفیاتِ شعوری میں کوئی احساس پیدا ہوتا ہے تو یقین کر لو کہ وہ شعر، شعر ہے اور اس کا کہنے والا شاعر۔

شاعر کو اس وقت سنو جب وہ اپنے نغموں کی مستی میں سرشار ایک والہانہ انداز سے پیامِ روح خود اپنے کانوں تک پہونچا رہا ہو۔ جب چاند اور تارے اُس کے نغمات پر گوش بر آواز ہوں۔ جب شجر و حجر اس کی روحانی آواز سے جھوم رہے ہوں اور جب اُسے بھری محفل میں بھی اس کا یقین ہو کہ اس کے نغمے اس کے سوا اور کوئی نہیں سُن رہا ہے۔

شاعر کی بعثت کبھی اور کسی زمانے میں بند نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس کے پیام سے نظام روحانیت کی بقا فطرت کو مقصود ہوتی ہے۔ وہ عالم روحانیت کے آداب و آئین سے مادی دنیا کی کثافتوں اور الم ناکیوں کو مغلوب و مفتوح کر کے انسانی عظمت و افضلیت کو قائم و باقی رکھنا چاہتا ہے۔ وہ فطرت کی طرف سے عالم کون و فساد کی اصلاح کے لئے متعین ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی ہر دور میں ضرورت ہوتی ہے اور وہ ہر دور میں موجود ملتا ہے۔

بیلی (Bailey) کہتا ہے کہ شاعر خیالات پیدا نہیں کرتے۔ بلکہ خیالات خود شاعروں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسے جنگلوں اور میدانوں میں خدا کی قدرت سے خودرو درخت اور پھول پیدا ہوتے ہیں۔ شاعر کی روح اور اس کا جسم فطرت سے وابستہ ہے۔ اس کے دل پر کائنات کی تمام صورتیں جلی حروف میں منقوش ہیں۔ شاعری کتابوں میں قید نہیں۔ وہ قوت اور وہ روح جس کی تجھے تلاش ہے تیرے ہی پاس موجود ہے۔ تجھی میں ہے اور پھر ہر جگہ موجود ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ پچھلی رات کو جب کاروانِ انجم و ماہ میں آثار
درماندگی پیدا ہو جاتے ہیں اور چاند اپنی سنہری کرنوں کو آہستہ آہستہ
سمیٹنا چاہتا ہے تو رات کے سناٹے میں ایک موزوں آواز محسوس
ہوتی ہے۔ میری روح اُسے الفاظ میں تبدیل کر دیتی ہے اور میرے
دماغ پر ایک ایسا لطیف شعر مرتسم ہو جاتا ہے جسے میں کبھی نہیں بھولتا
اور کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایک ناآشنائے حقیقت کے لئے اس شعر
میں کوئی بات ہو یا نہ ہو۔ لیکن ایک آشنائے رموزِ فطرت کے سامنے جب میں یہ شعر پڑھتا ہوں
تو مجھے اس کی روح اپنی روح کے ساتھ وجد و رقص کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

شیکسپیر کے قول کے مطابق شاعر کی آنکھ ایک دیوانی لرزش
میں عرش سے زمین اور زمین سے عرش تک دیکھتی ہے۔ اس کا تخیل
ان اشیاء کو پیدا کرتا ہے جن کی تشکیل معلوم نہیں ہوتیں۔ وہ
عدم کو وجود سے بدل دیتا ہے۔

شاعر کی یہ قوتیں معجزے سے تعبیر کی جا سکتی ہیں۔ ایسے معجزوں
سے جن کا معیار پیغمبرانہ اور انداز انسانیت کا خلاق ہو۔ شعر موسیقی
کی اساس ہے۔ اور سحر شعر و موسیقی کا ایک مرتب نتیجہ۔ ایسا نتیجہ

جس سے سماعت کے بعد دل اور روح دونوں متاثر و مغلوب ہو جاتے ہیں۔

علمی و فنی اعتبارات کی منزل میری منزل سے الگ ہے لیکن اگر ان دونوں منزلوں میں شاعر اور شعر کی عظمت و شخصیت معلوم ہو جائے تو کون انکار کر سکتا ہے کہ شاعر ہماری دنیا کا سب سے زیادہ واجب التعظیم اور سب سے زیادہ محترم انسان ہے۔

مصوّری
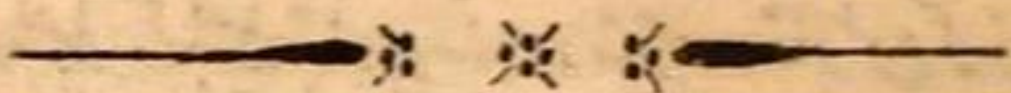
اگر ذاتِ باری اپنی برکات کو محض روح تک محدود رکھتی تو یہ ہنگامہ زارِ عالم محض ایک جمود آباد بنکر رہ جاتا۔ نہ یہ زندگی کی دلچسپیاں ہوتیں۔ نہ حق و باطل کی جنگ۔ نہ کوئی حسین ہوتا کہ اس کے لئے قبیلے کے قبیلے تباہ ہوتے اور نہ پرستارِ حسن کہ خاک اڑانے کے لئے صحرائے نجد کی تخلیق ہوتی۔ گو حُسن و عشق کا سلسلہ روحانی ہے لیکن کاروانِ محبت کا مادّی منزل سے گذرنا ناگزیر ہی روح کی تحفظ کے لئے مادّے کی ضرورت تھی۔ شاعر پیدا ہوا اور اُس نے مادّیات کا تارو پود بکھیر کر رکھدیا۔ مصوّر آیا اور اس نے مادّیات کا ایک ہیولہ تیار کر لیا۔ شاعر روحانیات میں گم تھا اور مصوّر مادّی دُنیا میں سرخوش و محو۔ لیکن رفتہ رفتہ مصوّر کی بانگ بھی اس وادی میں

گونجنے لگی جہاں شاعر خیمہ زن تھا۔ اور یہ اس کے ارتقا کی انتہائی منزل تھی

کائنات شعر ہے۔ شاعر الفاظ کے ذریعے شعر کہتا ہے۔ مغنی آواز،

سنگ تراش آلہ سنگ تراشی اور مصوّر تصویر کشی کے ذریعے شعر کہتا ہے

ہر حسن کار کی دنیائے خیال الگ ہوتی ہے۔ مصوّر کے آسمان کے ستارے

بھی اپنی رفعت سے ایک گیت گاتے ہیں۔ اور ہر وقت رقص و تبسم

میں محو رہتے ہیں۔

میرے خیال میں بہترین تصویر وہ ہے جس کو دیکھتے ہی فی من

میں ایک افسانہ مرتب ہو جائے اور جو بجلی کی طرح خیالات کو کہیں سے

کہیں پہونچا دے۔ تصویروں سے ذوق نہ رکھو۔ آرٹ کی تلاش کرو۔

اور اگر تم ایک بھی معیاری تصویر حاصل کرنے میں کامیاب ہو تو وہ

تمہارے کمرے کے تمام مرقعوں سے بدرجہا بہتر و افضل ہو سکتی ہے۔

تاریخ، ہندوستان کے ذوقِ مصوّری کی شاہد ہے۔ از منہ قدیم

کی یاد تازہ کرنے کے لئے اجنٹا کے غار اور مالوہ کے جنوبی حصے میں اب

تک کچھ تصاویر موجود ہیں۔ یورپین اقوام ۱۸۱۹ء میں ان سے آگاہ

ہوئیں۔ میجر گل نے تیس برس کی محنت کے بعد ان کی نقل کی۔ لیکن

سنہ ۱۸۶۶ء میں کرسٹل پیلس میں آگ لگ جانے سے وہ ضائع ہوگئیں۔ اس کے بعد جان گرفتھ نے ان کی نقل شروع کی۔ لیکن بدقسمتی سے ان کا بھی آدھے سے زیادہ حصہ آگ کے شعلوں کی نذر ہوگیا۔ جو کچھ باقی رہا وہ سیکریٹری آف اسٹیٹ کے حکم سے شائع کر دیا گیا۔ غار نمبر ۱۶ میں ایک تصویر ہے۔ (۴ فٹ ۱۱ انچ × ۴ فٹ ۳ انچ) جس میں ایک شہزادی کو عالم نزع میں دکھایا گیا ہے۔ مسٹر گرفتھ کے قول کے مطابق یہ اجنتا کی بہترین تصویر ہے اس کی توضیح انہیں کے الفاظ میں یہ ہے۔

"........ ایک قریب المرگ عورت سر جھکائے نیم باز آنکھوں اور بے حس اعضا سے اپنے بستر پر اس طرح سہارا دیئے ہوئے ہے جس کا مشاہدہ آج بھی نفسیاتی طور پر ہر گھر میں کیا جا سکتا ہے۔ ایک دوشیزہ اس کو سہارا دیئے ہوئے ہے۔ دوسری اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہی ہے اور بیمار عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے دُکھ کو محسوس کر رہی ہے۔ اس کے چہرے پر بہت افسوس ناک کیفیت ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اس بات کا علم ہوگیا ہے کہ اس کی محبوب سہیلی کی زندگی بہت جلد

ختم ہونے والی ہے۔ اس کے پیچھے ایک اور عورت ہاتھ میں پنکھا لئے ہوئی ہے اور بائیں طرف دو آدمی بہت ہی غم کی حالت میں اس کو دیکھ رہے ہیں۔ فرش پر اس کے دوسرے رشتے دار بیٹھے ہیں جن کی تمام امیدیں ٹوٹ چکی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماتم شروع کر چکے ہیں کیونکہ ایک عورت نے اپنا سر اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا ہے اور بہت دردناک طریقے سے رو رہی ہے"

تصویر میں اعضائی کیفیات کتنی ہی بھدی کیوں نہ ہوں لیکن قوت توضیح نے جو کیفیت پیدا کر دی ہے وہ دیکھنے والوں پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور یہی مصوری کا کمال ہے۔ مصور روزانہ زندگی کے واقعات کو موضوع بناتا ہے۔ اس کی ابتدائی تصویریں عنوانِ زندگی کی مظہر ہوتی ہیں۔ لیکن اس کی مشق رفتہ رفتہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کی صورت نگاری پر بھی اسے قادر کر دیتی ہے۔

ایک بنگالی نقاد کے قول کے مطابق ہندوستان میں اس وقت مصوری کے تین اسکول ہیں۔

۱- بمبئی اسکول ۲- بنگال اسکول ۳- پنجاب اسکول

بمبئی اسکول کو ساحلی آسانیوں کی وجہ سے استفادے کا بہت

زیادہ موقع ملا ہے۔ اور اس نے اپنی مصوری کو یورپین مذاق پر ڈالدیا ہے۔ رنگ آمیزی اور تصنع اس اسکول کی امتیازی خصوصیت ہے۔

بنگال اسکول نے یورپین اسلوب پر بنگال کی فضائے جمیل کو اپنا مطمحِ نظر بنایا ہے۔

پنجاب اسکول میں مختلف ذہنیتیں کارفرما ہیں۔ کسی طرف سے مغل آرٹ پیش کیا جارہا ہے اور کسی طرف سے ہندوستانی روایات کو تصویری جامہ پہنایا جارہا ہے۔ عبدالرحمان چغتائی کی تصاویر ملاحظہ فرمائیے تو ان میں اسلامی شان نظر آئے گی۔ اللہ بخش کی تصاویر دیکھیے تو ان میں پنجاب کی مقامی اور ہندوستان کی روایتی جھلک نظر آئیگی۔

"شمع فروزاں" چغتائی آرٹ کی ایک تصویر ہے۔ اس تصویر کے نازک اور منحنی خطوط میں جب نگاہ جذب ہوجاتی ہے تو بیک وقت دو شمعیں فروزاں نظر آتی ہیں۔ مصور کا کمال یہ ہے کہ ایک بجور عورت کی حرکات و سکنات سے شمع کے مقابلے میں ایک دوسری شمع قائم کردی ہے۔ یہ عورت عالمِ خیال میں بیٹھے بیٹھے اپنے ہاتھوں میں لمبے لمبے بال لئے ہوئے انہیں بیباختگی کے ساتھ بالائی فضا کی طرف اٹھا دیتی

ہے۔ یہ دونوں ہاتھ آپس میں مل کر لوبن جاتے ہیں اور بال دُھوئیں
کی صحیح تصویر نگاہ میں کھینچ دیتے ہیں۔ اس حالت میں عورت کے بل
کھانے سے "دود پیچاں" اور "شمع فروزاں" کا مرقع پیدا ہو جاتا ہے
اور چہرے کا روشن پہلو اس انسانی شمع کی فروزانی ثابت کر دیتا ہے
تصویر تخلیقی ہے جسکا کریڈٹ چغتائی کی شاعرانہ تخیل کو ہے۔

اللہ بخش کی تصویر "رادہا اور کرشن" میں گو تخیلی محاکات اور
تخلیلی خطوط نہیں ہیں۔ بلکہ واقعہ پہلے سے موجود، اور تمام خطوط مرئی
اور حسن کارانہ ہیں۔ تاہم کرشن اور رادہا کو اس طرح پہلو بہ پہلو
دکھایا ہے کہ کرشن کا ایک ہاتھ رادہا کے سر پر گگری کا سرا پکڑے
ہوئے ہے اور دوسرا ہاتھ نازک دوپٹے کو سینے سے سرکانا چاہتا ہے۔
(ایک ناقابلِ برداشت نظارہ!) اس حالت میں رادہا کا ایک ہاتھ
گگری کو سنبھالنے اور دوسرا ہاتھ دوپٹے کو سرک جانے سے روکنے میں
مصروف دکھایا گیا ہے۔ کرشن اور رادہا کے پانوں کچھ اس ترکیب سے
پڑ رہے ہیں کہ فضائے تصویر میں ایک بے ترتیب عالمِ رقص پیدا
ہو گیا ہے۔ کرشن کے ہونٹوں کا غیر متبسم ہونا واضح کر رہا ہے کہ وہ تبسم

کی آہٹ کے بغیر رادھا کی گگری پر قابو یاب ہونے میں کمالِ احتیاط سے
کام لینا چاہتے ہیں اور رادھا کے حسین چہرے سے وہی کیفیت ٹپک
رہی ہے جو ایک دوشیزہ پر دفعتاً کسی موقع کے صدور کے وقت طاری
ہونی چاہئے۔ دونوں تصویروں میں رنگوں کا امتزاج اور حسن کا قیام
پنجاب اسکول کی اس خصوصیت کو نمایاں کرتا ہے کہ گویا اس میں بنگال
اسکول کے امتیازات ابھی موجود ہیں۔ موقلم کی نزاکتیں یوں تو دونوں تصویروں
کے خارجی خطوط سے نمایاں ہو رہی ہیں مگر ریشمی دوپٹے کی نزاکت و
لطافت نگاری میں ایک ایسا نازک کمال صرف کیا گیا ہے جسے نگاہ محسوس
کرسکتی ہے۔ مگر زبان بیان نہیں کرسکتی۔ ریشم کا باریک دوپٹہ۔
اس قدر نازک پردازوں سے بنایا گیا ہے کہ رادھا کے لہنگے کا رنگ
ریشم کے حجاب سے صاف نمایاں ہو جاتا ہے۔

بنگال اسکول کے کارناموں میں اس وقت میرے سامنے پی۔
گھوش کی دو تصویریں "بسنت" اور "مطربۂ فلک" ہیں بسنت کی
تصویر میں رنگ ہی ایک ایسی چیز ہے جو موسمی اثرات سے نظر کو متکیف
کر دیتا ہے۔ بالوں میں پھول بھرنا بھی بنگالی آرٹ اور معاشرت کی

خصوصیت ہے۔ لیکن اس تصویر کے ہاتھ میں سرخ گلاب کا پھول اور گلے میں زرد پھولوں کا دوہرا ہار بسنت کی معتدل کیفیات کا ترجمان ہے۔ گوری، سڈول اور بھری ہوئی کلائیوں میں بھی پھولوں کے گجرے پڑے ہوئے ہیں۔ غرضکہ نگاہ سینے سے بالائی حصۂ جسم پر جس طرف جاتی ہے پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ حصۂ زیریں سادہ اور بے تکلف ہے۔ ساری کا رنگ پیازی ہے جس کے کنارے بادامی ہیں۔ ماحول میں ایک سبزہ زار ہے جس میں سفید پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ایک چشمہ ہے جس میں سرخ کنول تیر رہے ہیں۔ بیک گراؤنڈ میں کچھ گلریز پودے اور گھنے شاداب درخت ہیں۔ تصویر پر نگاہ پڑتے ہی بسنت رت کی تمام کیفیتیں بہ یک نظر محسوس ہونے لگتی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سردی کے تکلفات سادگی سے بدل کر ایک حسین و جمیل دیوی کی صورت میں مصروفِ خرام ہیں۔

"مطربۂ فلک" میں بھی بنگالی آرٹ کی تمام بہارآگیں کیفیات و محسوسات موجود ہیں۔ کاہی رنگ کی ساری کو فضا میں کچھ اس طرح گردش دیگئی ہے کہ زہرہ آسمان سے بادلوں کے ساتھ اترتی

اور ہواؤں کے ساتھ جنگ کرتی نظر آتی ہے۔ گلے کا سفید ہار بھی ہوا میں اڑ رہا ہے۔ ہونٹوں اور ہاتھوں کے انداز سے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب کوئی نغمہ چھڑنے ہی والا ہے۔ اور فضائے معلّق پر رقص ہونا ہی چاہتا ہے۔ دونوں پاؤں کا آپس میں مل جانا اندازِ نزول کا ایک فطری نقشہ ہے۔ بڑی بڑی آنکھوں سے ظاہر ہے کہ "زہرہ" اپنے کمالِ رقص و سرود کی قوتوں پر اعتبار کرتے ہوئے انسانی دنیا کی طرف کچھ ایسی نازش سے دیکھ رہی ہے کہ گویا وہ بہت جلد تمام عالم کو مدہوش اور بدمست بنا دے گی۔

مغل آرٹ اور راجپوت آرٹ میں ایک حد تک مماثلت پائی جاتی ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دونوں میں کون کس کا مقلد ہے۔ مغل اپنا آرٹ ایران سے ساتھ لے کر آئے تھے۔ یورپ کی آرٹ گیلریوں میں زمانۂ زرتشت تک کے مرقعے پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس سے آگے چل کر ایرانی آرٹ نے جب ترقی کی تو اور عقیدت مندانہ خطوط تصویروں سے خود بخود غائب ہو گئے۔ آگ کی انگیٹھی جو قدیم ایرانی آرٹ کا لازمۂ خصوصی تھی آرٹ سے نکال دی گئی۔ اور اسکی جگہ دراز زلفوں اور چہرے کی کشادگی نے لے لی۔

راجپوت آرٹ میں لہنگا۔ کاکل۔ اور قشقہ قومی خصوصیات تھیں جو اب تک باقی ہیں۔ مگر ایرانی آرٹ قومی خصوصیات سے خالی رہا۔ البتہ درباری مرقعوں میں، درباری لباس اور مشرقی تصاویر میں جام و شراب اس آرٹ کیساتھ لازم و ملزوم رہے۔ راجپوت اور مغل آرٹ میں جو چیز مشترک ہے وہ خطوط کا اختصار اور ماحول کا تصویر کے ساتھ امتزاج ہے۔ جسے آرٹسٹ اپنی شاہکارانہ قوتوں سے اسقدر آسانی کے ساتھ دکھا دیتا ہو کہ ہندوستانی مصوّر کا غذ پر رنگ پھیلانے کے باوجود نہیں دکھا سکتا۔ مثلاً راجپوت آرٹسٹ کو اگر رات کا سماں دکھانا مقصود ہے تو وہ صرف چراغ کہیں آویزاں کردے گا یا کسی ایسی جگہ بنا دے گا جہاں نگاہ ضرور پڑتی ہو۔ اس کے برخلاف ہندوستانی مصوّر کو ضرورت ہوتی ہو کہ وہ مسہری، شمع، چاند، تارے اور ایسے ہی چند لوازمِ شب بنا کر رات کا سماں مکمل کرے ——— مگر راجپوت آرٹ پر مغل آرٹ کو ترجیح و تفوق حاصل ہے اور آج بھی عجائب خانوں اور نگار خانوں میں مغل آرٹ نسبتاً زیادہ نظر یاب ہے۔

مجھے ان لوگوں کی روشِ خیال پر تعجب ہوتا ہے جو شعر و موسیقی سے دلچسپی رکھنے کے باوجود انکے ربطِ باہمی کی حقیقت سے بیخبر ہیں۔ میرے خیال میں موسیقی کی بنیاد زندگی کے اس فلسفے پر ہے کہ انسان محض گوشت اور ہڈیوں کے مجموعے کا نام نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو فطرت انسانوں کی بجائے مشینوں کی تخلیق کرنے پر مجبور ہوتی۔ کیونکہ مشینیں انسانوں سے بدرجہا بہتر اور بدرجہا افضل کام سرانجام دے سکتی ہیں۔ ہمیں روح بھی ودیعت کی گئی ہے۔ اور موسیقی براہ راست ہماری روح سے ٹکر کھاتی ہے۔ میں گراموفون کے ریکارڈ کی آواز کو حقیقی موسیقی کا درجہ نہیں دیتا۔ جو لوگ روحانیات کو اس طرح مادی لباس پہناتے ہیں وہ میرے خیال میں ایک خوبصورت غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

گو میں ماہر موسیقی نہیں لیکن مجھے موسیقی سے اتنی دلبستگی ہے کہ اگر دن

میں ایک دفعہ کسی کو راگ الاپتے ہوئے نہ سن لوں تو مجھے اپنے مجسمے "پرنالے پرچل" کا دھوکا ہونے لگتا ہے۔ میرے احباب کا اعتراض ہے کہ اگر مجھے واقعی موسیقی سے عشق ہے تو میں سوسائٹی میں گنگنانے کا عادی کیوں نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میری فطرت ایک حد تک خاموش واقع ہوئی ہے۔ میں جنگل میں پہاڑی کے فراز پر اور ایسی جگہ جہاں انسانیت نے اپنی مادیت کا جال نہ بچھایا ہو۔ اپنے نغموں کا ساز آزادانہ چھیڑ سکتا ہوں۔ لیکن اگر مجھے اپنے گردوپیش مادیت کا احساس ہو جائے تو میرے "دل کی کھڑکیاں" بند ہو جاتی ہیں۔

جب میں کسی نغمہ خواں کو نغمہ خوانی میں مصروف دیکھتا ہوں تو میری روح اس کے نغمے میں گم ہو کر اس سے متصل ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں میری روح سے مادیت کے تمام لباس اتر جاتے ہیں۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں رہتا کہ میں کہاں ہوں۔ میرا دل اکثر چاہتا ہے کہ میں نغمہ سنتے سنتے سو جاؤں تاکہ میرا خواب بھی مترنم رہے اور میری بیداری بھی نغمے کی آغوش میں ہو۔ میں اس نغمے پر مادی دنیا کی ہر چیز نچھاور کر دینے کے لئے تیار ہوں جو گرمی کے موسم میں چاندنی رات میں، آدھی شب گزر جانے کے بعد مجھے بیدار کر دے اور میں عالم نیم خوابی میں اس کا کیف حاصل کرنے کے بعد پھر ایک مست خواب میں

کھو جاؤں۔

ہماری سوسائٹی میں مغنّی کو بہت بڑا درجہ حاصل ہے۔ مغنّی کی معیت میں روح کو مسرت ہوتی ہے۔ جس کی ہر تان پرواز روح کی دعوت اور ہر صدا بالیدگیٔ روح کا اعلان ہوتا ہے۔ دُنیا کی کوئی چیز موسیقی کے اثر سے خالی نہیں۔ کہتے ہیں کہ جب حضرت داؤد علیہ السّلام زبور شریف کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ تو آب رواں بھی ٹھہر جاتا تھا۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر سرود و غنا اپنی حقیقی اور فطری شان میں ہو تو وہ آسمان اور زمین کی گردش کو بھی روک سکتا ہے۔ اور پھر اُن روحوں کا کیا کہنا۔ جن کی تخلیق ہی نغمے سے ہوئی ہو۔

موسیقی سے اس قدر شغف رکھنے کے باوجود میں اکثر مغنّی سے خوف زدہ رہتا ہوں اس لیے کہ اگر اس نے روح کی پوری قوت سے نغموں کا کیف برسا دیا تو میرا بیخود ہو جانا یقینی ہے۔ خدا کیلئے کسی ایسے وقت میری موت اور زندگی کا سوال پیدا نہ کرو۔ جب سوسائٹی کو میری خدمات کی اشد ضرورت ہو۔

میں نے گراموفون کو موسیقی سے ایک الگ چیز قرار دیا ہے۔

گراموفون کی آواز بھی کسی مغنی ہی کی آوازِ پس پردہ ہوتی ہے۔ لیکن مجھ پر ریکارڈ کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ میں مغنی کی آواز سننے کے ساتھ ساتھ اسے دیکھنا بھی چاہتا ہوں۔ آنکھوں سے نہیں۔ کانوں سے اور دل سے۔ نغمے کا جو اثر مغنی کی موجودگی میں ہو سکتا ہے وہ پسِ پردہ نہیں ہو سکتا۔ پس پردہ کہاں؟ پسِ مشین۔ اس مشین کے پردے میں جس میں مغنی کی آواز سائنس کے ذریعے ڈھالی گئی ہو۔ گراموفون کا ریکارڈ گاتا ہے ؎

کل چمن میں چار کلیاں چُن کے مجرم بن گیا
آج صحرا میں مرا ہر خار دامن گیر ہے

اگر یہی شعر کسی مغنی سے سنا جائے تو اس کی کیفیات دوسری ہونگی۔ کیا گراموفون سے دلچسپی رکھنے والی روحیں "ساؤنڈ بوکس" میں مقید نہیں کی جا سکتیں؟ جن کی تمام تر دلچسپیاں گراموفون کے ریکارڈ ہی میں بند ہوتی ہیں۔ جب ایک مغنی اپنی خوش آوازی سے مندرجہ بالا شعر گاتا ہے تو اس کے چہرے پر اس شعر کی تمام کیفیاتِ رقصاں اور لرزاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن گراموفون کے ریکارڈ میں یہ بات کہاں! ریکارڈ کے بعد ٹاکی کا درجہ ہے۔ خدا ان سائنس والوں سے سمجھے

جنھوں نے موسیقی کو بھی افراد ڈرامہ کے ساتھ ساتھ "اسکرین" پر قید کر دیا. ٹاکی کو ریکارڈ کا ارتقائی درجہ دیا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ خود ہی غور فرمائیے کہ جو غزل آپ سنیما کے پردے پر سنتے ہیں جب وہی غزل اسٹیج پر گائی جاتی ہے تو لطف میں کس قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔ ٹاکی کو میں تھیٹر کے مقابلے میں اس لئے بھی کم درجہ دیتا ہوں کہ تھیٹر میں "ونس مور" کہنے کے بعد وہی غزل پھر سُنی جا سکتی ہے لیکن ٹاکی میں یہ خوش قسمتی نصیب نہیں۔ اس لئے یا تو دوسرے دن تشریف لائیے یا اگر فلم کسی دوسری جگہ چلا گیا ہے تو وہاں کا ٹکٹ لیجیے۔

بچّے روتے ہیں۔ مجھے تو ان کے رونے میں بھی موسیقی کی لہر دوڑتی نظر آتی ہے اور بعض اوقات تو میں ایک بچّے کو ہنسنے کی بجائے روتا دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ ممکن ہے اس باب میں مجھے قسی القلب قرار دے دیا جائے مگر واقعہ یہ ہے کہ میں بچوں کو اکثر دانستہ رُلا دیتا ہوں۔ اور اس کی وجہ وہی موسیقی سے وابستگی ہے۔

جہاں میں ایک مغنّی کی آواز میں موسیقی کی تڑپ محسوس کرتا ہوں وہاں آبشار، پرندوں کے چہچے، سمندر کی امواج کے مدوجزر

میں بھی مجھے موسیقی جوش مارتی نظر آتی ہے۔ میں خاموشی سے فطرت کے نغمے کی سماعت میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ اور مادی رشتوں کو بھول کر فطرت کی ہر چیز سے اپنی روح کو متوازن دیکھتا ہوں۔ میں لاری کی آواز میں بھی شیطان کو گاتا ہوا پاتا ہوں۔ اور جب میرا تانگہ کسی سنسان سڑک پر خاموش فضا میں چلتا ہے تو میں گھوڑے کی ٹاپ سے بھی موسیقی کے شعلے نکلتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

شعر اور موسیقی کا تعلق ازلی اور ابدی ہے۔ موسیقی شعر ہی کا پھیلاؤ ہے۔ میرے خیال میں انسان نے شعر کہنے سے پہلے گایا ہوگا۔ آواز کی موزونیت سے جو فقرے یا الفاظ پیدا ہوئے انہیں اشعار کہہ لیا گیا۔ ہر شاعر شعر کہنے سے پہلے گنگناتا ہے اور آج کل تو اس شاعر کی قدر و منزلت دو چار انچ زائد ہو جاتی ہے جو شعر کہنے سے پہلے اور شعر کہنے کے بعد بھی گانا جانتا ہو۔ میں تو شعر میں اپنا راگ شعر کہنے کی حالت ہی میں بھر دیتا ہوں اس لئے مجھ سے یہ شکوہ فضول ہے کہ میں اپنا کلام ترنم سے نہیں پڑھتا۔ اگر میری موسیقی سے لذت گیر ہونا چاہتے ہو تو میرے اشعار پڑھو۔ میرے اشعار ہی

میری موسیقی ہیں۔

ایک سائنس داں کا قول ہے کہ ہر شخص کو ایک دن میں کم از کم دس منٹ ضرور گا لینا چاہئیے۔ تاکہ جذبات اور احساسات میں تازگی رہے اور روح کو مادی ماحول کے انتشار میں سرشاری و سرخوشی کا موقع ملتا رہے۔ احساسات اور جذبات کو زندہ رکھنے کے لئے موسیقی سب سے زیادہ کامیاب علاج ہے۔

ایک بے سروسامان بھکارن جس کے پاس نہ اچھے کپڑے ہوتے ہیں نہ ساز ہوتا ہے نہ آواز۔ صبح کے دھندلکے میں جب ہمارے مکان کے پیچھے آکر اپنی غمناک موسیقی میں یہ صدا لگاتی ہے ؎

ہم نَفَس یہ نَفَس کا خواب گراں کچھ بھی نہیں

تو کہاں فتنے جگاتا ہے یہاں کچھ بھی نہیں

تو مجھے ہزاروں ارباب نشاط اور آراستہ و پیراستہ ایکٹرسوں کی آواز سے زیادہ اس کی آواز متاثر کر دیتی ہے۔ میری نیند اڑ جاتی ہے اور میں "خواب گراں" کے فلسفے پر غور کرتے کرتے "کچھ بھی نہیں" کے نتیجے پر پہونچنے کی کوشش میں محو ہو کر رہ جاتا ہوں۔ مجھے ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ شعر کا ہر لفظ اور لفظوں کا ہر حرف عبرت و حسرت کا نشتر بن کر میرے دل میں اُترا جا رہا ہے اور میں عبرت و حسرت کے اس حملے کو کسی طرح نہیں روک سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ موسیقی کے لئے ساز کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن میں اس سے متفق نہیں۔ یہ کہنے کی بجائے یوں کہئے کہ موسیقی کیلئے سوز کی ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب موسیقی روح سے تعلق رکھتی ہے تو اس کے لئے ہر چیز روحانی ہونی چاہیئے نہ کہ مادی۔ روح کی نوازش کے لئے مادّے کو کیوں کام میں لایا جائے۔ بعض اوقات لَے کی خرابی مدہم اور پنچم سے ناواقفیت یا سُر اور دُھن کی غیر مطابقت سے موسیقی اتنی مجروح ہو جاتی ہے کہ اگر میرا بس چلے تو ساز و رباب چھین کر مغنی کو جلاوطن کر دوں۔ میں موسیقی میں شعر سُننا چاہتا ہوں۔ سُننا ہی نہیں چاہتا۔ سمجھنا بھی چاہتا ہوں۔ لیکن بعض مغنی مجھے صرف اپنی آواز کے ذریعے مسحور کرنا چاہتے ہیں۔ بیشک ان کی آواز کے زیر و بم میں سحر ہوتا ہے۔ لیکن میں نی۔ نی۔ ساما۔ آ آ کی مہمل صداؤں سے اپنی سماعت کو تکلیف نہیں پاتا۔ میں

کچھ الفاظ بھی سُننا چاہتا ہوں۔ میں موسیقی کے ساتھ جذبات کی آگ بھڑکتی ہوئی دیکھنا چاہتا ہوں۔ جو احساس و پندار اور ہوش و حواس کو اپنے رنگین شعلوں سے جلا دے۔ پھر کچھ پروا نہیں اگر بجز آ آ اور سا سا کے کچھ سُنائی نہ دے۔ روح کی دنیا میں الفاظ نہیں ہوتے۔ وہاں صرف کچھ آوازیں ہوتی ہیں اور آواز کی کیفیت معنی پیدا کرتی ہے۔

نسائیت شعر ہے اور حسن موسیقی ہے۔ اس لئے جو نغمہ کسی مغنیہ کی زبان سے نکلتا ہے وہ شعر اور موسیقی سے بنی ہوئی ایک مکمل تصویر ہوتا ہے۔ موسیقی شاعر کے جذبات (شعر) کے ساتھ رقص کرتی ہے اور اُن کے اظہار و تشریح میں معاون ہوتی ہے۔ موسیقی کی کوئی خاص صورت نہیں۔ لیکن جب شاعر اسے جذبات و الفاظ کا پیرہن عطا فرماتا ہے۔ تو یہ متشکل بھی ہو جاتی ہے۔ موسیقی کے ساتھ اداکاری تلوار کے ساتھ تیر کا کام دیتی ہے لیکن اداکاری کا استعمال اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب موسیقی "الفاظ" و "جذبات" کی حامل ہو۔

"لچکت آوے البیلی پنہارنی"

گاتے ہوئے کمر کو لچکانا اور ہاتھ کو سر پر اس طرح لیجانا کہ گویا گگریا سنبھالا جا رہا ہے۔ "لچکت آوے" اور "پنہارنی" انہیں دو الفاظ کی محاکاتی تصویریں ہیں۔ جو بغیر ان الفاظ کے بن ہی نہیں سکتیں۔ منقولات کو دعوی ہے کہ راگ اور راگنی سے بغیر الفاظ جنگل میں آگ لگ سکتی ہے۔ سوکھے ندی نالوں میں پانی بھر سکتا ہے اور بغیر فصل کے آسمان پر گھنگور گھٹائیں جھوم سکتی ہیں۔ اس امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ راگ اور راگنی کی مہمل آوازیں۔ تال سُر اور اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ممکن ہے فطرت کی سمجھ میں آجاتی ہوں۔ جو خود بھی گونگی یا خاموش ہے۔ ابر کی آہٹ۔ رعد کی گرج۔ ہوا کی سنسناہٹ، آبشار کا شور، سمندر کا تموج، چڑیوں کا نغمہ، کلیوں کا چٹکنا حقیقت میں صدائے بے الفاظ ہے۔ مگر بزم فطرت میں ان سب کی پذیرائی ہے۔ اسی طرح آواز کے اُتار چڑھاؤ۔ پھیلاؤ سمٹاؤ اور جزر و مد سے۔ فطرت اگر متاثر ہو جاتی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

معقولات کے ماتحت موسیقی کے سحر کا میں قائل ہوں اس طرح
کہ وہ الفاظ و جذبات میں متشکل ہو۔ ایک انسان کے لئے جس کے
پہلو میں دل بھی ہو الفاظ و جذبات کی سخت ضرورت ہے میں تو
ان دو لفظوں پر بھی ریٹ جاتا ہوں جو ایک جوگن کی زبان سے
کسی سنسان جنگل میں جوگی کی تلاش کے وقت بیساختہ نکل جائیں۔
اور وہ اپنی آواز کی پوری قوت سے کہے۔

او جوگی!

یہی دو لفظ میری اصطلاح میں شعر ہیں اور ان کے ادا کرنے
میں جو سُریلی اور بے چین آواز صرف ہوئی ہے وہ موسیقی ہے۔
آواز کے ساتھ نگاہوں کا جنگل کی وسعتوں میں پھیل جانا۔ گردن
کا بے ساختہ اُٹھ جانا اور کچھ دیر کے لئے خاموشی کا مسلط ہو جانا
حقیقی اداکاری ہے

جب دو لفظوں میں ایک جادو۔ ایک تلوار اور ایک تیر
چھپایا جا سکتا ہے تو پھر خود خیال کیجئے کہ جذبات و واردات سے
مطابق الفاظ میں جو مکمل شعر کہا جائے اور آواز کی تمام رعنایوں

کے ساتھ گایا جائے وہ کسی طرح بھی قابل برداشت ہو سکتا ہے؟

شعر و موسیقی میں "موزونیت" جزو مشترک ہے۔ آواز کی موزونیت "موسیقی" ہے اور الفاظ کی موزونیت شعر۔ میرے خاموش کمرے میں بجلی کا پنکھا جب ایک ہی انداز سے پہروں چلتا ہے تو اس کی آواز میں موزونیت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں اُس آوازِ موزوں کو الفاظ کی شکل میں تبدیل کر لیتا ہوں اور پھر خاموشی سے شعر و موسیقی کا لطف لیتا ہوں۔ مجھ پر اتنا کیف طاری ہوتا ہے کہ میں اس کے اثر سے سو جاتا ہوں اور میری روح شعر و موسیقی کے امتزاج سے آسودہ نظر آتی ہے۔
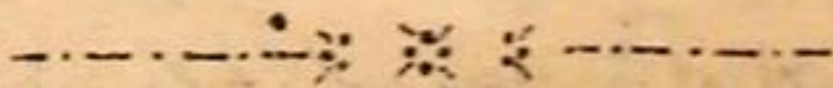
تقریظ

میرے معنوی بھائی اور محترم دوست جناب محمد صادق ضیا چنیوٹی نے اپنی ادبی تصنیف "حسن کار" میں حسنِ قلم، حسنِ طبیعت، حسنِ خیال، اور حسنِ زبان کو فنونِ لطیفہ کی طرح ایک جگہ جمع کر کے اپنے فطری ذوقِ ادب کا بہت پاکیزہ نمونہ پبلک میں پیش کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ ذوق اور اظہارِ ذوق صرف کالج کی تعلیم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ درگاہِ ادب و شعر کی ہم جلیسی و ہم نشینی کا بھی صلہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ضیا صاحب کے معاصر ان کی اس اقدام کی تقلید کریں اور ہمارے کالجوں کا ہر نوجوان ضیا صاحب کی طرح میدانِ ادب و فن میں گرم خرام ہو۔

جناب ضیا کا مخصوص اسلوب بیان ان کے افکار کا ایک کارنامۂ ذاتی ہے۔ جس چمن کی پہلی بہار اسقدر نزہت افزا اور زندگی افروز ہو اس کی آیندہ بہاروں کا

اندازہ لگانا گویا غیر فانی رنگا رنگ پھولوں کی ایک جنت میں سیر کرنا ہے۔

ناقد جب فنونِ لطیفہ کی ان خوشگوار مگر دشوار گذار وادیوں میں ضیا صاحب کی آزاد خرامیاں اور دلنشیں جولانیاں دیکھے گا تو اسے بیک وقت معلومات، محسوسات، شاہدات اور مطائبات کے جلوے نظر آئینگے۔ ایسی تصنیف ادب اُردو میں ایک خوبصورت اضافہ اور ایک الحاق جمیل ہے میں دعا کرتا ہوں کہ "حسن کار" ضیا صاحب کے جوان افکار کیطرح رفعت و قبولیت حاصل کرے اور ضیا صاحب اس کے بعد اپنی دوسری تصانیف سے بھی دنیائے ادب کو جلد مستفید فرمائیں

فضل الدین اثر اکبر آبادی
جوئینٹ سکریٹری سیماب لٹریری سوسائٹی آگرہ

یکم جنوری ۱۹۳۶ء

اِدارۂ قصرالادب اگرہ

قصرالادب آگرہ کی بنیاد موسم بہار سنہ ۱۹۲۳ء میں رکھی گئی تھی جو بفضلہ اسوقت تک پورے استحکام کے ساتھ قائم ہے اور جس کی شاخیں مختلف حصص ملک میں کھل چکی ہیں۔ قصرالادب صوبۂ متحدہ کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مستند خالص ادبی ادارہ ہے

قصرالادب کے مقاصد قیام میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ مصنفین اردو کی مفید تصانیف شائع کرے۔ اس مقصد کی تکمیل اسی طرح ممکن ہے کہ حامیانِ اردو اور علم دوست اربابِ وطن قصرالادب کے معاون ہوں یا مطبوعات قصرالادب خرید کر اس علمی وادبی ادارے کی ترقی واستحکام مزید کی کوشش فرمائیں۔ اب تک کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اور مندرجہ ذیل کتابوں کی اشاعت وطباعت کا انتظام ہو رہا ہے۔

قصرادب (دیوان غزلیات حضرت مولینا سیماب اکبرآبادی) عام فہم عروض، تذکرہ شعرائے اکبرآباد۔ خطبات شاعری۔ مغربی شاعری پر تنقید وغیرہ

جو حضرات قصرالادب کے معاون ہیں انکی خدمت میں تمام مطبوعات بغیر معاوضہ نذر کی جاتی ہیں۔ اگر آپ ابتک قصرالادب کے معاون نہیں ہیں تو آج ہی دستورالعمل طلب فرما کر اس ادبی ادارے میں شریک ہو جائیے۔ اس ادارے کو سیاسی اور مذہبی کتابوں کی اشاعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ناظم قصرالادب۔ آگرہ۔ (یو۔پی)

کارِ امروز
بیسویں صدی عیسوی کا غیر فانی ادبی کارنامہ
مصنفہ
مولانا سیماب اکبرآبادی
دسمبر ۱۹۳۳ء تک مولانا نے جتنی قومی، اخلاقی، سیاسی، اور ادبی نظمیں
جدید کہی ہیں وہ سب اس مجموعے میں موجود ہیں۔ ہر نظم اپنا اثر دل اور روح پر
براہِ راست کرتی ہے۔ "کارِ امروز" عالم اور اہلِ عالم کے لئے ایک پیامِ انسان
وانسانیت کے لئے ایک درس، حُسن وعشق کے لئے ایک قانون، اور ادب وشعر
کے لئے ایک معیار ہے۔ دو مشہور ادیبوں کے دیباچے بھی شریک ہیں۔ خوبصورت
جلد پر سنہری ڈائی۔ کاغذ قسم اعلیٰ۔ کتابت درجہ اول۔ طباعت بہترین مع
تصویرِ مصنف۔ قیمت فی جلد عہ (چار روپیہ) علاوہ محصول۔ ملنے کا پتہ
دفتر اشاعت "کارِ امروز" قصر الادب۔ آگرہ
(یو۔ پی)